مونوگراف

خواجہ الطاف حسین حالی

ڈاکٹر شہزاد انجم

اردو اکادمی دہلی

[illegible]

مونوگراف

خواجہ الطاف حسین حالی

ز انجم

ڈاکٹر شہزاد انجم

اردو اکادمی دہلی

سلسلہ مطبوعات اردو اکادمی دہلی نمبر ۱۴۸

Monograph

Khwaja Altaf Husain Hali

By

Dr. Shazad Anjum

Pub. by

URDU ACADEMY, DELHI

Print

2007, 2010

Rs.45/-

ضابطہ

سنِ اشاعت

۲۰۰۷، ۲۰۱۰ء

پینتالیس روپے

اصیلا آفسیٹ پریس، کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۲

اردو اکادمی، دہلی، سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

ISBN: 81-7121-151-8

فہرست

● حرفِ آغاز	سکریٹری	9
● پیش لفظ	وائس چیئرمین	11
● پیش گفتار	مصنف	15
● حیات و شخصیت		23
● نثر نگاری		45
● شاعری		66
● انتخاب نثر و نظم		99
○ کتابیات		156

خواجہ الطاف حسین حالی

ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر میں

''تاریخِ سیاسی میں، تاریخِ علمی میں، تاریخِ معاشرت میں، تاریخِ ادب میں، جہاں کہیں پچھلی نصف صدی میں کسی صحیح حرکت کی روانی دکھائی دے تو اس کا سلسلہ، اس ادیب، شاعر، مصلح، محبِّ وطن اور سب سے زیادہ اُس صاف دل اور فرشتۂ خصائل انسان کی کاوشِ ذہنی کے چشمۂ صافی سے جاملتا ہے۔''

Prof. SHARIF HUSAIN
COLLECTION

حرفِ آغاز

دلّی ہمیشہ ہندوستان کے دل کی دھڑکنوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ اسی لیے ''عالم میں انتخاب'' اس شہر بے نظیر کی تاریخ و تہذیب، علم و فن اور زبان و ادب کو پورے ملک کی نمائندگی کا شرف حاصل ہے۔ آزاد ہندوستان کی یہ تاریخی راجدھانی بجا طور پر اردو زبان و ادب کی راجدھانی بھی کہی جا سکتی ہے۔ اسی کے گرد و نواح میں کھڑی بولی کے بطن سے زبانِ دہلوی یا اردو نے جنم لیا جو اپنی دھرتی کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی ضرورتوں کے زیرِ سایہ نشو و نما پا کر اس عظیم تہذیب کی ترجمان بن گئی جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کا نام دیتے ہیں اور جو ہماری زندہ و تابندہ تاریخی وراثت ہے۔

دلّی کے ساتھ اردو زبان اور اردو ثقافت کے اسی قدیم اور اٹوٹ رشتے کے پیشِ نظر ۱۸۹۱ء میں دہلی اردو اکادمی کا قیام عمل میں آیا اور ایک چھوٹے سے دفتر سے اکادمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ آج دہلی اردو اکادمی کا شمار اردو کے فعّال ترین اداروں میں ہوتا ہے۔ اردو زبان و ادب اور اردو ثقافت کو فروغ دینے کے لیے اکادمی مسلسل جو کوششیں کر رہی ہے، انھیں نہ صرف دہلی بلکہ پورے ملک نیز بیرونی ممالک کے اردو حلقوں میں بھی کافی سراہا گیا ہے۔

اکادمی کے دستور العمل کی رو سے دہلی کے لیفٹننٹ گورنر پہلے اکادمی کے چیئرمین ہوتے تھے، دہلی میں منتخب حکومت کے قیام کے بعد اکادمی کے چیئرمین دہلی کے وزیرِ اعلیٰ ہو گئے ہیں جو دو سال کے لیے اکادمی کے اراکین کو نامزد کرتے ہیں۔ اراکین کا انتخاب دہلی کے ممتاز ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اساتذہ میں سے کیا جاتا ہے جن کے مشوروں کی روشنی میں چیئرمین کی منظوری سے اکادمی مختلف کاموں کے منصوبے بناتی اور انھیں رو

بہ عمل لاتی ہے۔ اکادمی اپنی سرگرمیوں میں دہلی اور بیرونِ دہلی کے دیگر اردو اداروں سے بھی باہمی مشورت اور تعاون قائم رکھتی ہے۔

اردو اکادمی، دہلی اپنی جن گوناگوں سرگرمیوں کی وجہ سے پورے ملک میں اپنی واضح پہچان قائم کر چکی ہے، ان میں ایک اہم سرگرمی اکادمی کی طرف سے ایک معیاری ادبی رسالے ماہنامہ ''ایوانِ اردو'' اور ''بچوں کا ماہنامہ امنگ'' کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ معیار کی علمی اور ادبی کتابوں کی اشاعت بھی ہے۔

زیرِ نظر مونوگراف اس سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں اردو اکادمی نے ادبِ عالیہ کے حوالے سے کلاسیکی ادباء و شعراء کے مختصر حالاتِ زندگی اور ان کی منتخب تحریروں کو شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ نئی نسل ہمارے مشاہیر کے حیات اور کارناموں سے واقف ہو سکے۔ اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر قمر رئیس شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اکادمی کے اشاعتی شیڈول کو اپنی ترجیحات میں شامل کیا اور ان نوجوان قلم کاروں کو مونوگراف تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی جو ادب کے میدان میں اپنی شناخت قائم کر چکے ہیں۔ میں اس کتاب کے مصنف کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے بڑی محنت لگن اور دلجمعی کے ساتھ اس کام کو مکمل کیا اور ہماری درخواست پر اس ذمہ داری کو بھی خود ہی ادا کیا کہ کتاب کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ بھی اپنی نگرانی میں کرائی۔ ان کی اس محنت نے اکادمی کے اشاعتی ذخیرے میں بیش قیمتی اضافہ کیا ہے۔

ہم اردو اکادمی دہلی کی چیئرپرسن محترمہ شیلا دکشت کے ممنون ہیں جن کی سرپرستی اکادمی کی کارکردگی میں معاون ہوتی ہے۔ اکادمی کے دیگر ممبران کے سرگرم تعاون اور مفید مشورے ہمارے لیے رہنمائی کا کام کرتے ہیں جس کا اعتراف ضروری ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ زیرِ نظر کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ عام قارئین کی دلچسپی کا باعث بھی ہوگی۔

مرغوب حیدر عابدی

سکریٹری

پیش لفظ

ادبِ عالیہ (کلاسیک) کیا ہے؟ اس کا تشخص کن اوصاف و عناصر سے ہوتا یا ہو سکتا ہے؟ ادبِ عالیہ، رومانوی ادب یا جدید ادب کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل ہے یا ہو سکتی ہے جو ان کی آزاد اور علیحدہ شناخت قائم کر سکے؟ ان سوالات پر خاصی بحث ہو چکی ہے۔ ٹی ایس ایلیٹ نے شاید اسی نزاع کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ اصطلاحیں (کلاسیک۔ رومانٹک) ادب کی سیاست سے تعلق رکھتی ہیں اور ایسے جذبات کو ابھارتی ہیں جنھیں ہوا کا دیوتا اپنی زنبیل ہی میں رکھے تو مناسب ہوگا۔

یہ دراصل برطانوی نوآبادیاتی شکنجہ تھا جس کے تحت ہم نے اپنے کلچر اور ادب کے مظاہر کو ایسے نام دیے جو انگریزی کی مستند لغات میں مستعمل تھے اور ان سے وہی معنی و مفہوم اخذ کرنے کی کوشش کی جو ان لغات میں درج تھے۔ ان میں ایک اصطلاح کلاسیک تھی جس کا ترجمہ 'ادبِ عالیہ' زیادہ پسندیدہ سمجھا گیا۔ حالاں کہ ادب کے طلبا نے اس سے جو مراد لی وہ تھی قدما کا تخلیق کردہ وہ ادب جو پختگیٔ فن اور جمالیاتی لطف و انبساط کے ساتھ دوامی اوصاف کا حامل ہو۔ جو ایک زندہ روایت کا درجہ حاصل کر کے آنے والی پیڑھیوں کو متاثر کر سکے۔ ہر عہد، جس کی قدر و قیمت اور معنویت کو از سرِ نو تلاش کرے۔ اور پھر جس کے گھنے سایے تلے نئے تخلیقی پودے نمو پا کر برگ و بار لائیں۔ جزوی فرق کے ساتھ کم و بیش ادبِ عالیہ کا یہی مفہوم اردو میں رائج رہا ہے۔

یہ موقع نہیں ہے کہ ان ادبی اصطلاحوں کی سیاست یا اس بحث کی موشگافیوں میں الجھا جائے۔ اپنے مقصد کے لیے بہتر ہوگا کہ ہم ادبِ عالیہ کے اسی تصور کو ذہن میں رکھیں

اور اس کی تلاش و تعبیر میں تھوڑی سی لچک کو بھی گوارا کریں۔

سوال یہ ہے کہ دلّی کے ادبِ عالیہ کے نمائندہ ادیبوں اور سخنوروں کے بارے میں مونوگراف تیار کرانے کی تحریک کیوں کر ہوئی؟ اور اس کتابی سلسلے کا مدعا کیا ہے؟ اس حقیقت سے اہلِ نظر آشنا ہیں کہ ادبِ عالیہ ہی نہیں، معاصر ادب کے مطالعہ کا ذوق وشوق بھی اب ناپید ہوتا جا رہا ہے۔ عام پبلشر ہی نہیں بڑے سرکاری ادارے بھی جو اعلیٰ معیار کی کتب شائع کرتے ہیں ان کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اردو کا عام قاری ان کو خریدنے کی ہمت نہیں کر پاتا۔ اگر وہ کلاسیکی ادب کے شاہکاروں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہے تو اسے اکثر ضخیم دیوانوں یا نثری کتب کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ آج کے مصروف انسان کے پاس اتنی فراغت اب کہاں ہے کہ وہ ضخیم دفتر پڑھے۔ تو یہی حال طلبا کی ضرورتوں اور نصابی کتب کی دشواریوں کا ہے۔ باشعور اور خوش ذوق طلبا ادبِ عالیہ کے مطالعہ کا شوق اور جذبہ ضرور رکھتے ہیں لیکن وہ بھی ضخیم اور قیمتی کتابوں سے استفادہ کی ہمت نہیں کر پاتے۔ انھیں معیاری، مستند اور ارزاں کتابوں کی طلب ہوتی ہے۔ اس لیے اردو اکادمی کی اشاعتی کمیٹی نے حال ہی میں ہر پہلو سے غور کر کے یہ طے کیا کہ قدیم عہد کے ادبِ عالیہ کے نمائندہ ادیبوں اور شاعروں پر علمی انداز کے مونوگراف تیار کرائے جائیں۔ دہلی میں ایسے ناقدین اور کلاسیکی ادب کے ماہرین کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو حسن وخوبی کے ساتھ یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اشاعتی کمیٹی کی سفارش پر ہم نے ایسے عالموں کی ایک فہرست مرتب کر لی ہے۔ اس کے ساتھ ہی کمیٹی نے ان اکابر قلم کاروں کی ایک فہرست بھی تیار کی ہے جن کے بارے میں پہلے دور میں مونوگراف تیار کیے جا رہے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں:

شعراء: فائز دہلوی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم چاندپوری، شیخ ابراہیم ذوق، میر اثر، مرزا غالب، مومن خاں مومن، نجم الدین مبارک آبرو، شیخ ظہور الدین حاتم، بہادر شاہ ظفر، داغ دہلوی۔

نثر نگار: شاہ عالم ثانی، میر امن، مرزا غالب، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی ذکاء اللہ، میر ناصر علی دہلوی، علامہ راشد الخیری۔

یہ فہرست حتمی یا مکمل نہیں ہے۔ اشاعتی کمیٹی اس میں ترمیم وتوسیع کرتی رہے گی۔

ہم نے اہلِ قلم حضرات سے گزارش کی ہے کہ وہ سادہ وشگفتہ اسلوب میں مونوگراف تیار کریں۔ صفحات کی تعداد ۲۱۱ سے ۸۲۱ تک ہوتا کہ یکسانیت رہے۔ اس کا دو تہائی حصہ مونوگراف پر مشتمل ہو۔ یعنی مصنف یا شاعر کی زندگی کے مستند حالات۔ تصانیف اور تصنیفی زندگی کے محرکات۔ اس کی نگارشات کی نمایاں اور منفرد خصوصیات اور دوسری اہم معلومات مونوگراف کا حصہ ہوں۔ اس کے بعد ایک تہائی یا اس سے کچھ کم صفحات میں اس کی تخلیقات کا ایک جامع انتخاب شامل ہو۔

یہ بات ایک حد تک طمانیت کا باعث ہے کہ جن ناقدین نے مونوگراف لکھنے کی ذمہ داری قبول کی انھوں نے اشاعتی کمیٹی کی ہدایات کو امکانی حد تک مانا اور پھر ان پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ البتہ دہلی کے چند ممتاز ادیبوں نے خرابیٔ صحت یا کسی دوسری مجبوری کے باعث معذرت کر لی۔

اگر یہ سلسلہ پسند کیا گیا اور اس کی افادیت کو مانا گیا تو نہ صرف اسے جاری رکھا جائے گا بلکہ اسے زیادہ بہتر، دیدہ زیب اور موثر بنایا جائے گا۔

پروفیسر قمر رئیس
وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی

پیش گفتار

مغلیہ دور کا سورج غروب ہو چکا تھا اور فرنگی اقتدار پر مکمل طور پر قابض ہو چکے تھے ایسے وقت میں ہندوستانی ادب کے اُفق پر ایک روشن ستارہ اُبھرتا ہے، جس کی چمک سے سبھوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پانی پت جو کہ اقتدار کی جنگ کا ہمیشہ گواہ رہا اور ہندوستان کی تاریخی لڑائیاں یہاں لڑی گئیں۔ اسی شہر میں ایک نہایت ہی کم سخن و کم آمیز، خلوص و مروّت کا پیکر، ایثار و قربانی کا نمونہ اور انکساری و خاکساری میں بے مثل شخص کا جنم ہوتا ہے، جو اپنی فارسی اور عربی کی صلاحیتوں اور اردو کی بیش بہا خدمات کے لئے تاریخ رقم کرتا ہے، زمانہ میں جسے خواجہ الطاف حسین حالی (۱۸۳۷-۱۹۱۴ء) کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جسے حکومتِ وقت شمس العلماء کے خطاب سے نوازتی ہے۔

حالی کی ذاتی و خانگی زندگی اور پھر اس کے بعد ان کی ادبی نگارشات کو دیکھا، پرکھا اور محسوس کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اردو کا دامن ایسی شش جہات اور جامع الصفات شخصیات سے بھرا ہوا ہے۔ حالی میں علم کا شوق زندگی بھر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔

حالی نے جب ہوش سنبھالا تو خاموشی سے پانی پت سے دہلی پیدل ہی حصول تعلیم کے لئے نکل پڑے۔ زمانے کی ٹھوکریں کھائیں مگر علم سے رشتہ ایسا قائم رکھا کہ انہیں کسی مشکل کی پروا بھی نہیں رہی۔ غالب و شیفتہ کی صحبتوں سے حالؔی کے افکار و خیالات میں ایسا نکھار پیدا ہوا کہ زندگی بھر وہ سینے میں ان یادوں کو سمیٹے رہے۔ رہی سہی کسر سرسید نے پوری کردی۔ گو کہ سرسید کے ساتھ ان کا قیام بہت کم دنوں تک رہا مگر ان کی روشن خیالی و وسیع النظری سے وہ حد درجہ متاثر ہوئے اور سرسیّد کے رفقاء میں شامل رہے۔ غالب کی زندگی،

شخصیت اور شاعری پر پہلی بار حالی نے ہی مدلل و مفصل کتاب ''یادگار غالب'' لکھی۔ جسے اردو ادب کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ سرسید کی زندگی اور ان کے کارناموں پر حالی کی کتاب ''حیات جاوید'' کو شاہ کار کا درجہ حاصل ہے بھلے ہی بقول شبلی اس کتاب میں ''مدلل مداحی'' کی گئی ہے۔ کاش شیفتہ پر بھی حالی کی کوئی ایسی ہی کتاب سامنے آئی ہوتی جسکے یقیناً شیفتہ مستحق تھے۔ شیفتہ کی مصاحبت سے حالی کو بڑا فائدہ ہوا۔ ہر علمی نکتے پر شیفتہ کی گہری نظر تھی اور وہ نہایت ہی وضاحت وصراحت سے اس کا بیان کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔ شیفتہ کے علم وفضل کا بڑا شہرہ تھا۔ ضلع گڑگاؤں کی جاگیر شیفتہ کی تھی۔ حالی کی انہوں نے سرپرستی کی اور نوازشات واکرام کی بارش کی۔ غالب سے حالی کی ملاقات شیفتہ کے ذریعے ہی ہوئی۔

بہرحال ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' کے بعد حالی کا ایک اہم علمی کارنامہ ''حیات سعدی'' بھی ہے۔ جس میں انہوں نے فارسی کے اس عظیم شاعر کی زندگی اور شاعری کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تینوں کتابیں تحقیقی وتنقیدی نوعیت کی ہیں۔ جن میں حالی نے نہایت ہی تحقیق وجستجو اور چھان پھٹک کے بعد غالب وسرسیّد اور سعدی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ اور ان کی علمی وادبی خدمات پر عالمانہ وفاضلانہ رائے پیش کی ہے۔ حالی کے خیالات وتحقیق سے حد درجہ اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ حالی جانبدار ہیں اور تحقیق حالی کا میدان نہیں، اسے ثابت بھی کیا گیا ہے لیکن اتنا تو طے ہے کہ ان کتابوں کی آمد سے اردو میں سوانح نگاری کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے اور پھر یہ کہ غالب شناسی ہو یا سرسیّد کا مطالعہ، حالی کی ان کتابوں کی حیثیت ہمیشہ سے بنیادی رہی ہے۔ حیات سعدی کا ایران میں فارسی ترجمہ بھی ہوا۔ ذہن بار بار یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ حالی نے ان شخصیات کی سوانح لکھنے پر ہی خود کو کیوں وقف کر دیا۔ جواب تو فوری طور پر دیا جا سکتا ہے کہ ان اشخاص سے حالی کی ذہنی مناسبت تھی اور سرسید وغالب کے ساتھ ایک خاص ربط اور لگاؤ تھا۔ مگر جواب بس صرف اتنا ہی نہیں ہے ابھی اس میں تحقیق کی کافی گنجائش ہے۔ حالی کا ذہنی

رویہ، ان کے احساسات، افکار، وضعداری و رواداری کا بھلا غالب کے ذہن و دل سے کیا ربط؟ کہاں مدو جزر اسلام اور کہاں غالب کی غزلیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حالی، غالب کی شخصیت، ذہانت و ذکاوت، مرتبے اور شاعری سے حد درجہ مرعوب تھے اور ایک خاص عینک سے سب کچھ دیکھنے کے خواہاں تھے۔ سرسید سے بھی حالی کی کوئی خاص قربت ابتدا میں نہیں تھی بلکہ یوں کہا جائے کہ حالی سرسید کے افکار و خیالات سے اتفاق نہیں کرتے تھے اور سرسید کے عمل کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو غلط نہیں ہوگا۔ بعد میں چل کر ان میں قربت جاگی، حالی کو سرسید کی سفارش پر حیدر آباد کے نواب کے ذریعے وظیفہ بھی عطا کیا گیا۔ حالی ''حیات جاوید'' کو سرسید کی زندگی میں ہی مکمل کرنا اور شائع کرانا چاہتے تھے مگر افسوس کہ حالی کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکی اور سرسید کے انتقال کے بعد یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ البتہ شیخ سعدی کی بزرگی، نیکی، خداترسی اور علمیت کا حالی پر ایک خاص اثر تھا اور ان کی نیکیاں ان کے دل میں ثبت و پیوست ہو چکی تھیں۔ حالی، سعدی کے قدرداں اور نام لیواؤں میں تھے۔

حالی کی زندگی اور ان کے علمی کارناموں کا مطالعہ مختلف خانوں میں تقسیم کر کے کیا جانا ضروری ہے۔ سوانح نگاری کے علاوہ حالی کو عظیم بنانے میں ان کی قومی، ملکی، اصلاحی، مذہبی شاعری کا بڑا دخل رہا ہے۔ بالخصوص حالی کی نظموں نے تو اس عہد میں امتِ مسلمہ کو بیدار کرنے اور آبا و اجداد کی اسلامی تاریخ کو پیش کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا جو آگے چل کر اردو شاعری کا خاص حصہ بن گیا۔ انہوں نے اپنے قلبی لگاؤ اور نظریات کو پیش کرنے میں بے حد وضاحت و صراحت سے کام لیا۔ اپنے موقف پر وہ اٹل رہے اور نظریے و افکار کی پیش کش میں وہ اکثر جوشیلے بھی نظر آتے ہیں۔ نظریاتی وابستگی اور پھر اس کے اظہار میں حالی کے یہاں کوئی جھجک نہیں پائی جاتی یہی انداز آگے چل کر اقبال اور اس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ حتیٰ کہ ترقی پسند شعراء کے یہاں بھی اظہار کا کھرا پن حالی کے توسط سے بھی آیا بلکہ اگر میں یہ بھی کہوں کہ عوامی زبان کو شعری پیکر میں ڈھالنے کا کام بھی حالی نے بخوبی انجام دیا جس کا نقش عوام کے دلوں پر بھی قائم

ہوا تو غلط نہیں ہوگا۔ ترقی پسند شاعری نے بھی یہ راستہ اختیار کیا اور عوام میں مقبول ہوئی۔ حالی نے اخلاقی قدروں اور اسلامی تاریخ وتہذیب کے موضوعات پر متعدد نظمیں لکھیں جو تاریخ ادب کا حصہ ہیں۔ حالؔی کی دیگر نظموں کے علاوہ ان کی مشہور زمانہ طویل نظم ''مدوجزر اسلام'' کو جو شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی اس کی مثال اردو نظم نگاری کی تاریخ میں شاذ ونادر ہی ملتی ہے۔ یہ نظم مدرسوں، خانقاہوں، اسکولوں اور عوام وخواص ہر طبقے میں بے حد محبت اور عقیدت واحترام سے پڑھی گئی۔ اس کے اشعار اور بند تو سبھوں کے حافظے میں محفوظ ہو گئے۔ یہ نظم سرسیّد کی فرمائش پر حالی نے لکھی تھی جس میں اُمت مسلمہ کی پوری تاریخ اور عروج وزوال کا موثر ذکر ہے۔ مذہبی حلقوں میں اس نظم کی دل پذیری کی وجہ سے اسے خاص درجہ عطا کیا گیا۔ اس نظم کے بارے سرسید فرماتے ہیں ''خدا جب حشر میں مجھ سے پوچھے گا کہ دنیا سے کیا لائے، تو میرا جواب یہی ہوگا کہ حالؔی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔'' حالی کی مثنویاں، قصائد، مراثی، غزلیں، رباعیات کی بھی ادب میں ایک خاص اہمیت ہے۔ بالخصوص مناظر فطرت پر ان کی مثنویوں اور مراثی نے تو حد درجہ شہرت ومقبولیت حاصل کی۔ کرنل ہالرائیڈ کی نگرانی اور محمد حسین آزاد کی پیش قدمی سے انجمن پنجاب لاہور کے مشاعروں میں حالی باقاعدہ شریک ہوئے۔ اِن مشاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ کسی ایک طے شدہ موضوع پر شعرا کو نظمیں پیش کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ حالی نے اِن مشاعروں میں قیام لاہور کے دوران چار معرکے کی مثنویاں برکھا رُت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف پیش کیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ حالی کی نظموں کی خصوصیت استدلال، ڈرامائیت، بیانیہ انداز اور مخصوص مقتضائے حال کے عین مطابق زبان ہے۔

حالی نے اپنی شاعری میں مکالماتی انداز اور ہندوستانی تلمیحات کو بخوبی برتا اور قومی وطنی، مذہبی، اخلاقی اقدار پر مبنی موضوعات کے علاوہ نیچرل مثنویاں بھی لکھیں۔ جہاں تک حالی کی غزل گوئی کا تعلق ہے ان کی غزلوں میں طہارت عشق کے عناصر واضح طور پر پائے جاتے ہیں۔ وہ شاعری سے لہو ولعب، لذت اندوزی، اور عشرت

پرستی کے قائل نہیں تھے۔ ان کی غزلوں میں حد درجہ سادگی اور زبان و بیان کی لطافت و ندرت موجود ہے۔ حالی کی شرافت، نیکی اور مصلحانہ و مبلغانہ ذہن و دل کی تصویر ان کی شاعری میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مذہب و تصوف اور پند و موعظت بھی ان کی شاعری میں موجود ہے لیکن ان کی غزلیں اکثر مقام پر ان معاملات سے دور بھی ہیں۔ حالی کے یہاں غزل کی شان پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ روز مرّہ اور محاورات کی چاشنی، دردمندی و سوز و گداز، سادگی و پرکاری، دل کشی و رعنائی، مدہوشی و سرمستی، سادگی و پُرکاری ان کی غزلوں کی شناخت ہیں۔

حالی ایک ممتاز سوانح نگار، شاعر، ادیب، انشا پرداز تو ضرور تھے لیکن اردو ادب میں ان کی انقلاب آفریں کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ہے۔ جس میں پہلی بار تنقید کے بنیادی اصول و ضوابط اور اصناف شاعری کے تعلق سے کھل کر بحث کی گئی اور ایک اصول بھی وضع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لفظِ کوشش کا استعمال میں نے غیر ارادی طور پر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی کے ذہن میں جو خاکہ تھا یا ایک تصویر بنی ہوئی تھی۔ اُسے انھوں نے نقل کرنے کی کوشش کی اور ادب میں اسے جاری و ساری رکھا جائے یہ ان کی خواہش و تمنا تھی۔ ان کے خیالات و افکار کی مخالفت میں سخت آوازیں بھی اُبھریں۔ احسن فاروقی، کلیم الدین احمد، وحید قریشی نے تو ان کے تنقیدی اُصول اور خیالات کے بخیہ ادھیڑنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی مگر جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے ادبی تنقید میں حالی کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے ناقدین حالی کی اہمیت اور ان کے افکار کی معنویت کو بسر و چشم تسلیم کر رہے ہیں۔ وارث علوی اپنے طویل مضمون ''حالی مقدمہ اور ہم'' میں لکھتے ہیں:

> ''حالی کے مقدمہ پر اس طویل مقدمہ بازی کے لیے معذرت خواہ ہوں'' لیکن کیا کیا جائے لے دے کر ہماری تنقید میں حالی کا مقدمہ ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے ہمارے قد کو ناپا جائے، میں تو یہ نہیں کہوں گا کہ حالی کے سامنے ہم سب بونے نظر آتے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ حالی کے آئینے میں جب ہم اپنا عکس دیکھتے ہیں تو کافی ٹوٹے پھوٹے لوگ دکھائی

دیتے ہیں... حالی انسان کو اس کی حیوانی، انسانی اور روحانی تینوں سطحوں پر قبول کرتے تھے۔ انسان کو انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے نہیں دیکھا اس لیے ادب کو بھی انھوں نے ٹکڑے ٹکڑے نہیں دیکھا، حالی کی باتیں ایک مضبوط اور سالم ذہن کی باتیں تھیں۔''

گویا یہ کہ عہد حاضر کے جید ناقد وارث علوی بھی حالی کی تنقیدی بصیرت و بصارت کے قائل ہیں۔ آل احمد سرور تو بہت پہلے ہی یہ اقرار کر چکے ہیں کہ ''بیسویں صدی کی تنقید حالی کی اسی ذہنی قیادت کے سہارے ابھی تک چل رہی ہے'' اور کلیم الدین احمد کو بھی یہ اقرار کرنا پڑا تھا کہ ''کسی نے بھی مقدمہ شعر و شاعری سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔'' وہاب اشرفی بھی یہ اعتراف کرتے ہیں کہ ''حالی کی تنقید تو جدید ترین شعریات کے لیے بیج کا کام سرانجام دے رہی ہے۔'' لہٰذا اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو تنقید میں حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' پیش کر کے وہ لازوال کارنامہ انجام دیا جو انھیں اردو ادب میں ہمیشہ زندۂ جاوید رکھے گا۔ ادب میں حالی روم کے بادشاہ کی طرح تباہی و غارت گری اور آتش زنی پر محض خاموشی سے بیٹھ کر بانسری ہی نہیں بجاتے رہے بلکہ اجتہاد و اصلاح ان کی زندگی کا مشن تھا اور وہ اس پر قائم و دائم رہے۔ اس زمانے میں جبکہ بقول حالی:

''قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہو گئے ہیں۔۔ شریف خاک میں مل گئے ہیں علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں اور بگڑتے جا رہے ہیں۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا تمام قوم پر چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت اور تقلید سب کے گردن پر سوار ہے۔ امرا جو قوم کو بہت فائدہ پہنچا سکتے تھے، غافل اور بے پروا ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف...''

ایسے زمانے میں حالی نے گل و بلبل کی شاعری کرنے اور تخیل میں طوطا مینا اُڑانے

کی بجائے اعلیٰ انسانی اقدار کی بقا اور زندگی کو اعلیٰ مقاصد کے لیے صرف کرنے پر زور دیا۔ وہ مشرقی تہذیب وثقافت اور ادب کے شیدائی تھے۔ اُن کی زندگی سراپا خلوص وایمان سے آراستہ تھی۔ مذہب اسلام کا چراغ ہمیشہ اُن کے سینے میں روشن رہا۔ اعلیٰ اور اہم شخصیات کی زندگی میں وہ اس روشنی کے متلاشی رہے۔ انھوں نے اپنی نثر وشاعری میں اخلاقی قدروں، کردار وعمل، حقیقت وصداقت، انسانیت کو زندگی بخشنے اور روشنی عطا کرنے میں ساری زندگی صرف کردی۔ بلاشبہ اردو میں اس پائے کے بلند ادیب وشاعر کا بدل کوئی دوسرا شاید ہی مل پائے۔

اس مونو گراف میں ان نکات پر جامع گفتگو کی گئی ہے اور حالی کی نثر ونظم کا مختصر انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے۔

شہزاد انجم

حیات و شخصیت

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۹۱۴-۱۸۳۷) اُردو کے بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ اردو ادب کی تاریخ میں اُن کے علمی، تحقیقی، تنقیدی و سوانحی کارناموں اور اُن کی شاعری کو بنظر استحسان دیکھا گیا ہے اور اُن کی علمیت کا لوہا مانا گیا ہے۔ وہ فارسی زبان کے عالم تھے اور عربی زبان کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اردو شعر و ادب میں اُن کی خدمات بیش بہا ہیں۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید اُن کی وہ سوانحی کتابیں ہیں جن کا شمار اردو کی چند اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔ بالخصوص ''یادگار غالب'' کی حیثیت غالب شناسی میں بنیادی نوعیت کی ہے۔ غالب کی شخصیت اور شاعری پر سب سے پہلے حالی نے ہی اس قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ حالی کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' اُردو تنقید کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے، جس میں تنقید کے بنیادی اصول وضوابط سے بحث کی گئی ہے۔ اُردو ادب میں اس کتاب نے انقلاب برپا کر دیا اور ادب میں کھرے اور کھوٹے کی باقاعدہ تمیز کرنے کا سلیقہ عطا کیا۔

حالی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو ایک مخصوص اسلوب عطا کیا، جس میں سادگی وضاحت، روانی اور استدلال ہے۔

اُردو شاعری میں بھی حالی نے بڑے کارنامے انجام دیے۔ حالی نے غزل، نظم، مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، رباعی، قطعہ بھی اصنافِ سخن میں کمال حاصل کیا لیکن اُن کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے نظم نگاری کے فروغ میں نمایاں رول ادا کیا۔

حالی مشرقی تہذیب اور روایات کے دُرنایاب تھے۔ وہ شرافت، نیکی، خلوص، صداقت، انکساری، خاکساری، ایثار اور قربانی کے مجسّمہ تھے۔ اُن کی ذاتی شخصیت کا عکس اُن

کی تحریروں میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

آباءواجداد:

حالی کا سلسلہ نسب حضرت ابوایوب انصاریؓ سے ملتا ہے۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے ایک صاحب زادے حضرت عثمانؓ کے عہد میں کسی مہم کے سلسلے میں خراسان پہنچے اور انھوں نے ہرات کو اپنا مستقل مسکن بنالیا۔ اس خاندان کی نویں پشت میں شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری ایک بے حد پارسا بزرگ، جید عالم فن حدیث کے امام اور ممتاز صوفی تھے۔ اسی لیے انھیں شیخ الاسلام کہا جاتا ہے۔ خواجہ عبداللہ انصاری اپنے عہد کے معروف ادیب اور غیر معمولی صلاحیتوں کے خطیب بھی تھے۔ ان کی بزرگی اور زہد وتقویٰ کا چرچا چار سُو تھا۔ وہ پیرِ ہرات کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ خواجہ عبداللہ انصاری کی اٹھارہویں پشت میں خواجہ ملک علی، سلطان غیاث الدین بلبن کے دور حکومت میں اپنے دو بیٹوں خواجہ مسعود علی اور خواجہ نصیرالدین کے ساتھ ۶۷۵ھ مطابق ۱۲۷۶ء میں ہندوستان تشریف لائے۔ سلطان غیاث الدین بلبن، خواجہ ملک علی کے علم وفضل سے بے حد متاثر ہوئے اور انھیں منصب قضاوصدارت، تولیت مزارات ائمہ اور خطابات عیدین کے فرائض سے نوازا اور اندرونی قصبۂ پانی پت میں، متدبہ اراضی سوادِ قصبہ اور سیر حاصل دیہات پرگنہ پانی پت میں بخشا۔ خواجہ ملک علی کو پانی پت کا یہ زرخیز اور پرسکون علاقہ بے حد پسند آیا اور وہ یہیں مستقل طور پر آباد ہوگئے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے بقیہ ایام یہیں بسر کیے۔ پانی پت کے جس محلے میں انھوں نے قیام کیا تھا وہ محلّہ ان کے خاندان کی نسبت سے انصار مشہور ہوگیا۔ خواجہ ملک علی کی پندرہویں پشت میں حالی کی پیدائش ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں ہوئی۔

حالی کے والد ماجد کا نام خواجہ ایزد بخش تھا۔ ان کے دادا کا نام خواجہ بوعلی بخش اور پردادا کا نام خواجہ محمد بخش تھا۔ حالی کے والد خواجہ ایزد بخش انگریز سرکار کے سررشتہ پرمٹ میں ملازم تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے گھر کی آمدنی معقول تھی اور والد گھر کی ذمہ داریوں کو بخوبی نباہ رہے تھے۔ مگر اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ حالی کی ولادت کے بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہوگیا

اور ابھی حالی کی عمر محض نو سال کی تھی کہ ان کے والد محض چالیس سال کی عمر میں چل بسے۔ یہ سانحہ بڑا زبردست تھا مگر ایسے وقت میں حالی کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے حالی کی سرپرستی کی اور پرورش و پرداخت میں کسی طرح کی والدین کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ظاہر بات ہے حالی کو بھی اپنے بھائی خواجہ امداد حسین سے بڑی محبت تھی۔ خواجہ امداد حسین بھی شعروادب کا رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ ۱۸۸۶ء میں حالی کے بھائی خواجہ امداد حسین سخت بیمار ہوئے اور پانچ چھ مہینے تک بیمار رہنے کے بعد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ایامِ علالت میں حالی نے اُن کی بڑی تیمارداری کی لیکن قدرت کا فیصلہ ہو کر رہا۔ حالی شدید صدمے سے دوچار ہوئے۔ ان کے دل پر اس کا گہرا اثر پڑا اور انھوں نے اپنے بھائی کے سانحۂ ارتحال پر مرثیہ کہا جس کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

آتے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی

پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا، مر جانے کی ہے اُس کے نشانی

جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی

جس بھائی کی آغوش میں ہوش اس نے سنبھالا
جس بھائی کے سائے میں کٹی اس کی جوانی

شفقت نے دیا جس کو بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی

جیتا بھی رہا بھائی اگر اس بھائی کے پیچھے
لذت نہیں جینے کی نصیب اس کی اٹھانی

دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو!
کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

تعلیم

عام رواج کے مطابق حالی کی بسم اللہ خوانی ساڑھے چار برس کی عمر میں ہوئی۔ انھیں پہلے پانی پت کے مشہور قاری حافظ ممتاز حسین کے پاس قرآن کی تعلیم کے لیے بھیجا گیا، اور حالی نے قرآن شریف بہت جلد اپنے قوی حافظہ کی بدولت حفظ کر لیا۔ اس کے بعد فارسی کی تعلیم کی غرض سے معروف شاعر میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد جعفر علی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

سیّد جعفر علی کو فارسی ادب، تاریخ اور طب میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ ان کے فیض تربیت سے حالی کو بڑا فائدہ ہوا اور وہ فارسی زبان وادب سے بخوبی واقف ہو گئے۔ حالی کے دل میں عربی پڑھنے اور سیکھنے کی بھی خواہش ہوئی۔ پانی پت میں لکھنؤ کے حاجی ابراہیم حسین تحصیل علم کے بعد امامت کی سند لے کر آئے تھے۔ حالی نے ان سے عربی صرف ونحو کی کچھ ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد حالی مستقل تعلیم حاصل نہیں کر سکے۔ انھوں نے خود لکھا ہے:

''اگر چہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا، مگر مجھے
باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا موقع نہ ملا۔''

(مقالات حالی، حصہ اول، ص ۲۶۲)

مگر جسے علم حاصل کرنے کا ذوق وشوق ہو وہ بھلا کیونکر خاموش بیٹھ سکتا ہے۔ اسی درمیان حالی کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی صاحب زادی اسلام النساء سے کر دی گئی۔ اسلام النساء خوش حال گھرانے سے تھیں۔ اس وقت حالی کی عمر محض سترہ سال تھی۔ بڑے بھائی کی خواہش ومرضی کا احترام کرتے ہوئے انھوں نے کم عمری میں شادی تو ضرور کر لی۔ سعادت مندی اور فرماں برداری کا یہی تقاضا تھا کہ بزرگوں کی رائے سے اختلاف نہیں کیا جائے۔ لیکن حالی تعلیم کے شوق میں شادی کے بعد خاموشی سے گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلے آئے اور مدرسہ حسین بخش میں داخلہ لے لیا۔ حالی نے تقریباً ڈیڑھ برس دلّی میں قیام کیا اور مولوی نوازش علی سے صرف ونحو اور کچھ منطق کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اس عہد میں دہلی علم وادب اور تہذیب وثقافت کا اہم گہوارہ تھا۔ اس میں انگریزی مدرسوں کو علما مچھلے (یعنی جہالت کی جگہ) سمجھتے تھے اور علم صرف عربی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے حالی کے دل میں انگریزی تعلیم کا خیال کبھی بھول کر نہ گزرا۔ اُس زمانے میں دلّی کالج کا بول بالا تھا۔ محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، ماسٹر رام چندر، ماسٹر پیارے لال کے علاوہ متعدد ذہین عالب علم یہاں زیر تعلیم تھے مگر حالی کے دماغ میں یہ بات بٹھادی گئی تھی کہ کالج میں تعلیم حاصل کرنا مذہب کے خلاف ہے اسی لیے انھوں نے کبھی اُدھر کا رُخ نہیں کیا۔ قیام دہلی کے دوران انھوں نے مولوی نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض حسین، مولوی امیر احمد اور شمس العلماء، مولانا

میاں سیّد نذیر حسین جیسے باکمال عالموں سے بھی فیض حاصل کیا اور فارسی اور اردو کے اشعار کی وضاحت اور معانی دریافت کرنے کے لیے غالب کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور غالب سے چند فارسی قصائد بھی پڑھے۔ اس زمانے میں انھیں شاعری کا شوق ہوا۔ اپنا تخلص 'خستہ' رکھا۔ مگر غالب کے مشورے سے تخلص بدل کر 'حالی' کر دیا۔ جبکہ مالک رام صاحب کا خیال ہے کہ حالی نے اپنا تخلص شیفتہ کی صحبت کی وجہ سے تبدیل کیا۔ حالی نے اپنی چند غزلیں برائے اصلاح غالب کی خدمت میں بھی پیش کیں۔ غالب، حالی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے کہ اس کم عمری یعنی محض سترہ سال میں ایسی اُٹھان بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ حالی کی غزلوں کو انھوں نے پسند کیا اور فرمایا "اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا۔ مگر تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔" اس واقعے سے حالی کا حوصلہ بے حد بڑھ گیا اور وہ شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ شعری و ادبی محفلوں میں شریک ہونے لگے اور عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ دہلی کا یہ دور اُن کا پریشانیوں سے بھرا دور رہا ہے۔ جب اُن کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کو یہ معلوم ہوا کہ حالی دلّی میں ہیں تو وہ دلّی آئے۔ حالی سے ملاقات کی گھریلو پریشانیوں اور اُن کے خاموشی سے چلے آنے پر گھر والوں کی بے قراری کا ذکر کیا۔ انھوں نے حالی سے اصرار کیا کہ وہ اُن کے ساتھ پانی پت چلیں۔ ۱۸۵۵ء میں حالی اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کے ساتھ پانی پت چلے آئے۔

شادی

خواجہ الطاف حسین حالی کی شادی ان کے ماموں میر باقر علی کی صاحب زادی اسلام النساء سے ۱۸۵۳ء میں ۱۷ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ حالی کی والدہ سیدانی تھیں۔ ان کی بیگم بھی سیدانی تھیں جو بہت نیک اور خدا ترس خاتون تھیں، جنھوں نے پورے گھر کی ذمہ داری بے حد خوش اسلوبی سے اٹھائی لیکن طبعاً زود رنج بھی تھیں وہ اپنے شوہر کا حد درجہ خیال رکھتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ شوہر کی کوئی بھی بات ذرا بھی ناگوار گزرتی تو برملا اس کا اظہار بھی کر دیتی تھیں۔ حالی کو اپنی بیگم سے بے حد محبت تھی۔ تقریباً ۴۷ سال کی رفاقت کے بعد ہیضے میں

مبتلا ہوکر وہ چل بسیں۔ بیگم کے انتقال کا حالی کو بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن انھوں نے مومن کی طرح اللہ کے فیصلے کو صدق دل سے قبول کرلیا۔

اولاد

حالی کو خدا نے چار لڑکے اور دو لڑکیاں عنایت کیں۔ ان میں سے دو لڑکے اور ایک لڑکی بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ خواجہ اخلاق حسین ان کے بڑے صاحب زادے تھے۔ خواجہ سجاد حسین، حالی کے سب سے چھوٹے صاحب زادے تھے، جن کی ولادت ۱۸۶۱ء میں ہوئی تھی۔ حالی کی سب سے چھوٹی صاحب زادی کا نام عنایت فاطمہ تھا۔ جن کی ولادت ۱۸۵۹ء میں ہوئی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ حالی کی اولادوں نے تعلیمی میدان میں جو خدمات انجام دیں اور بزرگوں کا نام جس طرح روشن کیا۔ اس کی نظیر مشکل سے مل پائے گی۔ خواجہ غلام الثقلین، خواجہ غلام السیدین، بیگم صالحہ عابد حسین، مشتاق فاطمہ، خواجہ سجاد حسین، محترمہ سیدہ سیدین، پروفیسر صغریٰ مہدی کا تعلق حالی کے خاندان سے ہی ہے۔ یہ سبھی واقعی روشن چراغ ہیں۔ ان سبھوں کی قومی، علمی و ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ملازمت

جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ حالی کی شادی محض سترہ سال کی عمر میں کردی گئی تھی۔ سسرال کی آسودگی نے انھیں ذہنی آزادی عطا کی تھی اور فکر معاش سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے دلّی چلے آئے تھے اور ڈیڑھ برس تک تحصیل علم میں مصروف رہے۔ ۱۸۵۵ء میں جب وہ پانی پت واپس آئے تو وہاں بھی اپنے مطالعہ کے ذوق کو جاری رکھا۔ وہ ہمہ وقت کتابوں میں غرق رہتے۔ لیکن تلاش معاش کی غرض سے مجبوراً ۱۸۵۶ء میں انھیں پانی پت سے باہر نکلنا پڑا۔ حالی کو حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں نوکری کرنی پڑی۔ جہاں ان کی تنخواہ بے حد قلیل تھی۔ ابھی حصار میں حالی کے قیام کے ایک ہی برس ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی آگ سارے ملک میں پھیل گئی۔ اس کی تپش اور آنچ سے حصار بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ حالی

بے حد پریشانی کی حالت میں حصار سے پانی پت کے لیے پیدل ہی نکل پڑے۔ حصار سے پانی پت تک کا سفر اذیتوں بھرا تھا۔ وہ سخت مصیبتوں کا سامنا اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہوئے بے حد مشکلوں سے پانی پت پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس سفر کا ان کی صحت پر بے حد خراب اثر پڑا۔ ان کی صحت بری طرح متاثر ہوئی اور اس کا اثر پوری زندگی قائم رہا۔ پانی پت میں انھوں نے تقریباً چار برس قیام کیا۔ اس دوران انھوں نے پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی قلندر علی مرحوم سے منطق، فلسفہ، حدیث، تفسیر وغیرہ کا علم حاصل کرتے رہے۔ حالی کا علمی ادبی ذوق پروان چڑھتا رہا۔ اس درمیان میں انھوں نے پانی پت میں ملازمت کی بے حد کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوئے اور بالآخر انھیں ۱۸۶۱ء میں دلّی کا سفر کرنا پڑا۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد کی شکستہ وزبوں حال دلّی کی تصویر کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے بقول شاعر:

دلّی کے نہ تھے کوچے اوراق مصوّر تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

مگر دوسری طرف عالم یہ تھا کہ شعر وسخن اور علم وادب کا بازار گرم تھا۔ غالب، ذوق شیفتہ کے علاوہ متعدد ایسے نام موجود تھے جن کے دم سے دلی کی رونق قائم تھی۔ پہلی بار حالی جب دہلی آئے تھے تو ان کی عمر محض سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ اس بار تقریباً ۲۴ سال کی عمر تھی اور ان کا مطالعہ بھی وسیع ہو چکا تھا۔ دہلی میں حالی، محمد اکرم خاں شیدا کا دیوان خانہ جو کہ ادبی مرکز بنا ہوا تھا وہاں شریک ہونے لگے اور شعر وسخن کی محفلوں سے ان کی وابستگی ہونے لگی۔ دو سال تک حالی نوکری کی تلاش میں سرگرداں رہے لیکن انہیں کامیابی حاصل نہیں ہوئی ایک دن ان کی ملاقات ۱۸۶۳ء میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے ہوئی جو کہ جہانگیر آباد کے رئیس نواب تھے شیفتہ شاعری کا رچا ہوا ذوق رکھتے تھے۔ وہ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے انہوں نے حالی کو اپنی مصاحبت کی پیش کش کی جسے حالی نے قبول کر لیا اور سات آٹھ سال تک جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں رہے۔ حالی نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ خاں کے قدرداں اور عقیدت مند تھے۔ حالی کا بھی شعری ذوق بے حد ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ شیفتہ کے یہاں بے پناہ خوبیاں

تھیں۔ حالی ان کی علمیت، شاعری اور اعلیٰ ادبی ذوق سے متاثر تھے اور ان کے گرویدہ تھے۔ ۱۸۶۹ء میں شیفتہ کا انتقال ہوگیا۔ غالب کا انتقال بھی فروری ۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ حالی دل برداشتہ ہوگئے۔ روز گار کا مسئلہ بھی آ کھڑا ہوا اور حالی تلاش معاش کے سلسلے میں لاہور جا پہنچے۔ لاہور میں جہاں انھیں پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں ملازمت مل گئی۔ اس ادارے میں حالی کی ذمہ داری یہ تھی کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوا کرتے تھے ان کی اردو عبارت وہ درست کرتے تھے اور ان میں ادبی شان پیدا کرتے تھے۔ اس طرح انگریزی ادب سے ان کو ایک لگاؤ سا ہوگیا اور بقول حالی ''نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔'' لیکن حقیقت یہ ہے کہ حالی کا دل لاہور میں بالکل نہیں لگا۔ وہ تقریباً چار برس لاہور میں مقیم رہے۔ یہ قیام ملازمت کی وجہ سے بحالت مجبوری تھا۔ لاہور سے ان کا وہ ذہنی اور قلبی رشتہ قائم نہیں ہوسکا۔ حالی وہاں وبائی امراض کے شکار بھی ہوئے اور غریب الوطنی اور تنہائی کے شدید احساس نے انہیں درج ذیل اشعار لکھنے پر مجبور کر دیا:

دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد — نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت — مگر جوشِ سخن مہرِ دہن ہے
رہے لاہور میں آ کر سو جانے — یہی دنیا ہے جو دار المحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف — مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
یہاں بیگانگی ہے اس قدر عام — کہ بلبل ناشناسائے چمن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ — نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہ کن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور — تصور میں میرے اِک انجمن ہے
میری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم — خوشی میں میری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول — جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو — جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے
عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی — مگر یادِ عزیز راہ زن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام — یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے

گری نظروں سے سب باتیں پرانی　　مگر الفت　کہ اِک رسم کہن ہے
بھلا حالی اور الفت سے ہو خالی　　یہ سب تم صاحبوں کا حسن ظن ہے

کیا ہے اس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن تر ہے

درج بالا اشعار حالی نے تنہائی اور غم واندوہ کی حالت میں لاہور میں لکھے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قیام لاہور کے دوران حالی کا مغربی ادبیات سے رشتہ باقاعدہ قائم ہوا اور انگریزی زبان سے ان کی دلچسپی بڑھی۔ مغربی مفکرین، دانشوروں اور ادبا کی تحریروں کے مطالعے سے خود حالی کے افکار وخیال میں ایک انقلاب برپا ہوگیا جس کا احساس حالی کو فوری طور پر بھلے ہی نہیں ہو پایا ہو مگر حالی کے نظریۂ شعر میں جو تبدیلی آئی اس کی ایک بڑی وجہ قیام لاہور کے دوران انگریزی ادبیات سے براہِ راست وابستہ رہنا بھی ہے۔ حالی لاہور میں محکمہ تعلیم کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے ''اتالیق پنجاب'' میں سب ایڈیٹر بھی رہے۔ اس رسالے کے ایڈیٹر پیارے لال آشوب تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد بھی سب ایڈیٹر کے طور پر اپنی ذمہ داری نباہ چکے تھے کچھ عرصہ کے بعد یہ رسالہ بند ہوگیا اور ''پنجاب میگزین'' کے نام سے دوسرا رسالہ شائع ہوا۔ حالی اس رسالے سے بھی وابستہ رہے اور سب ایڈیٹر کی ذمہ داری انھوں نے بحسن وخوبی نباہی۔

لاہور میں پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد کی رفاقت اور کرنل ہالرائیڈ کی حوصلہ افزائی نے حالی کے مذاقِ شعر، ذوقِ سخن اور فکر میں واضح تبدیلی لادی۔ محمد حسین آزاد نے جب ۱۸۷۴ء میں مشاعروں کے لیے عنوان کے تحت شاعروں کو مدعو کرنا شروع کیا تو اس تاریخی مشاعرے میں حالی بھی شامل ہوئے۔ اس مشاعرے کی خصوصیت یہ تھی کہ یہاں غزلوں کے بجائے نظمیں پڑھی جاتی تھیں اور مصرع طرح کی جگہ شاعروں کو نظموں کے عنوان دیے جاتے تھے۔ شاعر کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ کسی بھی زمین بحر اور قوافی میں اپنی نظم پیش کرسکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے یہ مشاعرے، مشاعروں کی روایت کے خلاف تھے اور پرانے دبستان شاعری کے خلاف بغاوت کا ایک قدم بھی تھا۔ آزاد کی اس کوشش میں حالی نے اہم رول ادا

کیا۔ انھیں مشاعروں کے لیے حالی نے اپنی مشہور و معروف چار مثنویاں برکھا رُت، حبِ وطن، نشاطِ امید اور مناظرۂ رحم و انصاف لکھیں۔ حالی کی ان مثنویوں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور قیام لاہور کے دوران حالی کے مذاقِ شعر اور طرزِ سخن میں بھی واضح تبدیلی آئی۔

لاہور کے شعری و ادبی ماحول میں حالی گرچہ رچ بس گئے تھے لیکن دلّی کی یاد اور اس کی کشش انھیں ہمیشہ پریشان کرتی رہی۔ اتفاق سے انھیں دنوں دہلی کے اینگلو عربک اسکول میں عربی کے مدرّس کی جگہ خالی ہوئی اور حالی کی تقرری اس عہدے کے لیے ہوگئی۔ دلّی اینگلو عربک اسکول کا علمی ماحول اور مدرّسی کا پیشہ یہ سب حالی کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ وہ بے حد توجہ سے طلبا کو درس دیتے تھے۔ بہت جلد سبھی طلبا ان کے علم و فضل اور حسن اخلاق سے متاثر ہوئے اور حالی کی قدر و منزلت بڑھتی چلی گئی۔ اس ادارے میں حالی ۱۸۷۵ء سے ۱۸۸۹ء تک وابستہ رہے۔ اسی درمیان جنوری ۱۸۸۷ میں ایچی سن کالج لاہور میں بورڈنگ ہاؤس میں طلبا کے اتالیق کی حیثیت سے ان کا تبادلہ بھی ہوا۔ لیکن اس بار بھی حالی کو لاہور کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ انھیں طلبا کا رویہ بھی پسند نہیں آیا اور وہ ۱۸۸۷ء میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں واپس آگئے اور بحیثیت مدرّس خدمات انجام دینے لگے کیونکہ یہ وہ پیشہ تھا جو ان کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ ۱۸۸۹ء تک حالی اس اسکول سے وابستہ رہے۔

حالی کے علم و فضل کا چرچا چار سو ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۷ء میں جب حیدرآباد کے نواب سر آسمان جاہ بہادر نظام حیدرآباد کی سرکار میں مدارالمہام تھے، وہ شملہ جاتے ہوئے سر سیّد احمد خاں سے ملاقات کی خاطر علی گڑھ تشریف لائے اور ان کی کوٹھی پر قیام کیا۔ اسی سفر کے دوران سر آسمان جاہ بہادر کی ملاقات خواجہ الطاف حسین حالی سے ہوئی۔ نواب صاحب حالی کی علمیت و قابلیت اور فضیلت و مذاقِ سخن سے حد درجہ متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ حالی کی انکساری و خاکساری نے انھیں حالی کا گرویدہ بنا دیا۔ نواب سر آسمان جاہ بہادر نے حالی کا ۷۵ روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا جو مصنّفین کو عطا کی جاتی تھی۔ اب حالی معاش سے بے فکر ہو گئے۔ پانی پت ان کی جائے پیدائش اور آبائی وطن تھا مگر دارالسلطنت دلّی کی حکومت ان کے قلب و دل پر تھی۔ دلّی جو علم و فن اور شعر و ادب کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس شہر سے حالی کا ذہنی رشتہ

ایسا قائم تھا جسے وہ کبھی بھلانا نہیں چاہتے تھے۔ اب جبکہ انھیں پنشن مل رہی تھی وہ سکون سے پانی پت میں علمی کام کرنا چاہتے تھے پھر بھی دلّی کو خیر باد کہنا ان کے لیے بے حد مشکل تھا۔ دلّی سے اُن کی شدید وابستگی تھی مگر اب انھیں پنشن مل رہی تھی اس لیے وہ سارا وقت علمی کاموں میں صرف کرنا چاہتے تھے اور وہ مستقل طور پر پانی پت چلے گئے۔ حالی نے بے حد سخت تکلیف کے عالم میں دلّی کو چھوڑتے وقت یہ شعر کہا تھا:

دلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے دل سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا

دلّی کی حکمرانی ان کے قلب و دل پر تھی اور اسی لیے ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد حالی نے جو ''مرثیہ دلّی'' لکھا اردو ادب میں اس کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ ہر شعر درد و غم میں ڈوبا اور دلّی کی عظمت رفتہ کا احساس دلاتا ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں کی نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دل شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور! ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریائے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانہ ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رُلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے
اُن کی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت سویرے کہیں اے عیش ونشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمہارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی یارو!
یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومنؔ و علوی و صہبائی و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شبانا ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہے حالی
یاں مناسب نہیں رو رو کے رُلانا ہرگز

پانی پت کے ایام

حالی دہلی سے مستقل طور پر ۱۸۸۹ء میں اپنے آبائی وطن پانی پت کے موروثی مکان محلّہ انصاریان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مکان شہر کے بالکل وسط میں تھا اور ملاقاتیوں کا ایک سلسلہ بنا رہتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ شور و ہنگامے کی وجہ سے حالی کے علمی کاموں میں خلل پڑتا تھا۔ گھر والوں کا اتفاق رائے سے یہ فیصلہ ہوا کہ پانی پت ریلوے اسٹیشن سے دور حالی کی ملکیت میں جو ایک پرانا مکان تھا اس کی نئی تعمیر کرالی جائے۔ یہ کام ان کے صاحب زادے خواجہ سجاد حسین نے فروری ۱۸۹۰ء کے آخر تک پورا کرالیا اور حالی اپنے پرانے مکان میں فروری ۱۸۹۰ء میں منتقل ہو گئے۔ حالی اپنے علمی کاموں میں مصروف رہے لیکن گھریلو پریشانیوں اور اُلجھنوں نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ حالی کی بیگم سیدہ امۃ الرسول گرم مزاج خاتون تھیں۔ حالی کی صاحب زادی عنایت فاطمہ کے لڑکے عبدالولی کو مرگی کے دورے پڑتے تھے۔ عنایت فاطمہ کے شوہر خواجہ عبدالعلی کا بھی سلوک اپنی بیوی عنایت فاطمہ اور حالی کے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ یہ

سبھی وہ مسائل تھے جن کی وجہ سے حالی فکرمند اور پریشان رہا کرتے تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے خطوط میں اپنے دوستوں سے بھی کیا ہے۔ کئی مواقع ایسے بھی آئے جب انھیں پانی پت چھوڑنے کا ارادہ بھی کرنا پڑا لیکن انھوں نے اپنی ذہنی پریشانی کو قبول کرلیا مگر اپنی بیٹی اور نواسے کو تنہا نہیں چھوڑ پائے۔ ان ذاتی مسائل ومشکلات کو اپنے خطوط میں وہ اکثر مولوی محمد احسان اللہ خاں ثاقب، نواب وقار الملک اور اپنے شاگردوں عبدالرحیم خاں بیدلؔ، خواجہ لطیف احمد کو لکھا کرتے تھے۔ عبدالولی کے علاج پر کافی روپے خرچ ہوئے اور انھیں بے حد پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔ بقول صالحہ عابد حسین:

''ایک دفعہ عبدالولی پر ایسی شدّت کا دورہ پڑا کہ انھوں نے حالی کو دھکّا دے دیا، جس سے حالی گر پڑے۔ اس وقت خواجہ سجاد حسین موجود تھے۔ اُن سے عبدالولی کی یہ گستاخی برداشت نہ ہوسکی، انھوں نے عبدالولی کو ڈانٹا اور طمانچہ بھی ماردیا۔ یہ بات حالی کو سخت ناگوار گزری۔ جب تک سجّاد حسین نے عبدالولی کو منا نہیں لیا۔ حالؔی نے ان سے بات نہیں کی۔''

اِس واقعے سے حالی کی زندگی کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ عبدالولی کی بیماری سے تمام افرادِ خانہ کا متاثر ہونا، خاندان میں حالی کی حد درجہ عزت وتوقیر اور حالی کی نیک طبیعت اور اعلیٰ سیرت وکردار۔ حالی کی شرافت، بزرگی، نیک خلقی، مروّت، انکساری وخاکساری پر آئندہ سطور میں تفصیل سے گفتگو ہوگی۔ فی الحال یہ ظاہر کرنا ہے کہ پانی پت میں حالی کی پریشانیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ انھیں علمی وادبی کام کرنے کا بھی سکون مشکل سے ہی ملتا تھا اِسی لیے وہ اپنے عزیزوں، دوستوں، شاگردوں کے یہاں کبھی علی گڑھ اور کبھی دہلی، فریدآباد یا گڑگاؤں چلے جاتے اور اپنے علمی کاموں میں منہمک ہوجاتے۔ مگر انھیں گھر کی فکر لاحق رہتی وہ خواجہ لطیف احمد کو ۶/جون ۱۹۰۵ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میری حالت اب ایسی ہے کہ گھر کے سوا جہاں جاکر رہوں گا، وہاں میرا ہونا سب برباد ہوجائے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہاں بھی چین کے ساتھ

نہیں رہ سکتا۔ میرے حسبِ حال ذوقؔ کا یہ شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے''

(مکتوبات حالی، حصہ اوّل، ص ۱۹۴)

حالی کے یہ ایّام پریشانیوں میں گزرے۔ ایک طرف ان کی صحت مسلسل گرتی جارہی تھی، دوسری طرف ان کی گھریلو پریشانیاں کسی طرح کم نہیں ہورہی تھیں، ان کے ذہن میں کئی ایسے علمی کام تھے جنھیں وہ پورا کرنا چاہتے تھے۔ شاعری ونثر نگاری دونوں جانب اُن کی توجہ تھی۔ انھیں تنہائی اور سکون کی اشد ضرورت تھی اسی لیے وہ خاموشی سے پرسکون مقامات پر چلے جاتے اور اپنے علمی کام میں منہمک ہوجاتے۔

شمس العلماء کا خطاب

حالی کے علمی کاموں کی شہرت اس زمانے میں کافی پھیل چکی تھی۔ کئی انگریز افسران بھی حالی کے قدردان تھے، بالخصوص کرنل ہالرائیڈ حالی کے بے حد مداح تھے۔ کرنل ہالرائیڈ کو اردو زبان سے بڑی محبت اور دلچسپی تھی۔ اردو زبان کے فروغ میں کرنل ہالرائیڈ نے نمایاں خدمات انجام دی۔ بالخصوص ''انجمن پنجاب'' کے قیام اور نظموں کے فروغ میں انھوں نے خاص دلچسپی لی۔ انجمن پنجاب میں حالی نے برکھارُت، نشاطِ اُمید، مناظرۂ رحم وانصاف اور حب وطن جیسی شاہ کار چار نظمیں بے حد دل پذیر ودلکش انداز میں پیش کی تھیں۔ اردو نظم نگاری کی تاریخ میں ان نظموں کی بڑی اہمیت ہے۔ انجمن پنجاب دراصل کرنل ہالرائیڈ کے ذہن کی اُپج تھی اور حالی، محمد حسین آزاد کے بعد انجمن پنجاب کے اہم ستون تھے۔ کرنل ہالرائیڈ کے سامنے حالی کا پورا علمی کارنامہ موجود تھا۔ حالی کی کتاب ''مجالس النساء'' پر انھوں نے چار سو روپے انعام کی سفارش کی تھی۔ چونکہ اردو نثر میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے بعد یہ وہ کتاب تھی جس میں نہایت ہی آسان، سادہ اور سلیس زبان میں عورتوں اور بچوں کی اصلاح اور تربیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ دراصل یہ کتاب حالی نے اس

زمانے کے اعتبار سے قصے کے انداز میں لڑکیوں کے لیے لکھی تھی۔ یہ سب وہ معاملات تھے جو کرنل ہالرائیڈ کے پیش نظر تھے اور انھوں نے حکومت سے حالی کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازنے کی سفارش کی اور جون ۱۹۰۴ء میں منعقد ہونے والے ایک علمی دربار میں ہندوستان کے وائسرائے نارتھ بروک نے حالی کو پیش کیا۔ حالی کے مزاج میں جو انکساری وخاکساری تھی اس کی وجہ سے اعزازات وخطابات انھیں زیادہ متاثر نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن بہر حال یہ ایک بڑا اعزاز وخطاب تھا اور کسی بھی انسان کا خوش ہونا ایک فطری عمل بھی ہے۔ حالی اور ان کے خاندان کے دیگر لوگ بھی بے حد خوش ہوئے۔ مگر ساتھ ہی حالی کو یہ احساس بھی ستاتا رہا کہ اب انھیں کسی نئے حاکم ضلع یا ڈپٹی کمشنر کی آمد پر اس کی خدمت میں حاضری دینی ہوگی۔ سرکاری محفلوں میں شریک ہونا پڑے گا۔ حالی سادہ طبیعت اور حد درجہ انکسار اور خاکسار میں لپٹے ہوئے انسان تھے۔ وہ بھلا کہاں تک مجلسوں، محفلوں کی رونق بن سکتے تھے۔ انھیں تو خاموشی سے اپنے علمی کاموں کی تکمیل کرنا ہی اہم معلوم پڑتا تھا اور وہ مستقل طور پر اپنے علمی کاموں سے جڑے رہے۔

حالی کی زندگی کے آخری ایّام

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں سب سے زیادہ دہلی شہر متاثر ہوا۔ مگر دہلی کے اطراف بھی ان حالات سے محفوظ نہیں رہ سکے ایک طرف جہاں دلّی میں لوٹ اور غارت گری کا بازار گرم تھا وہیں قرب وجوار کے لوگوں کی مشکلیں بڑھتی جارہی تھیں اور دلّی کی تباہی کا حد درجہ اثر ان علاقوں میں ہو رہا تھا۔ ہر انسان اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ ابھی حالی کو دہلی آئے ہوئے مشکل سے ایک سال ہوئے تھے کہ انھیں ان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ حالی حصار سے پانی پت کے لیے چل پڑے۔ اس زمانے میں سواری کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ انھیں پیدل ہی سفر کرنا پڑا۔ یہ سفر کس قدر تکلیف دہ اور مشکلوں بھرا تھا جس کا بیان بھی مشکل ہے یہ سفر کے دِن حالی کی زندگی کے بے حد خوف ناک اور مصیبت بھرے ثابت ہوئے، نہ سونے کا ٹھکانا نہ کھانے پینے کا انتظام اور ہر وقت موت کا خوف۔ اس کا اثر حالی

کے ذہن و دماغ پر بُری طرح پڑا۔ جب وہ پانی پت پہنچے تو انھیں کئی طرح کی بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں اور ان کی صحت کافی گر گئی تھی۔ جس نے زندگی بھر انھیں ستایا۔ گویا یہ کہ وہ جوانی سے ہی بیماریوں کے شکار ہو گئے۔ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ کبھی بازو میں خلش تو کبھی دانتوں کے درد تو کبھی نزلہ اور کھانسی اور بلغم کا حد درجہ نکلنا۔ یہ سلسلہ جاری رہا۔ ایک دفعہ تو حالی کو سانس کی تکلیف ہوگئی اور معمولی جسمانی مشقت سے ان کا سانس پھول جاتا تھا۔ ۱۹۰۶ء میں انھیں موتیا بند کی شکایت ہوگئی تھی۔ مئی ۱۹۰۷ء میں ان کی داہنی آنکھ کا آپریشن پٹیالہ کے راجندر ہاسپٹل میں ہوا لیکن یہ آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ ۱۹۱۱ء میں کنگ اسپتال لکھنؤ میں ان کا دوبارہ آپریشن ہوا لیکن سوئے اتفاق سے یہ آپریشن بھی کامیاب نہیں ہوا۔ مگر اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ چشمے کی مدد سے حالی تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے لگے اور وہ اپنے نامکمل کاموں کو پورا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء کے آخر میں انھوں نے اپنے عربی اور فارسی کلام کو مرتب کرنا شروع کیا۔ وہ اپنا اردو کلام مرتب کر رہے تھے کہ اُن کی صحت آہستہ آہستہ گرتی جا رہی تھی۔ آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا تھا۔ اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود حالی نے اپنا عربی اور فارسی کلام مرتب کر لیا، جو اگست ۱۹۱۴ء میں شائع ہوا۔ بواسیر، بخار، نزلہ، زکام، دانتوں میں تکلیف اور آنکھوں کی پریشانی کا ان کی صحت پر برا اثر پڑا۔ بالکل آخری وقت میں ان کے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ انھیں بولنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی۔ دو چار لفظ مشکل سے ادا کر پاتے تھے۔ قوت سماعت تھی۔ کسی بھی سوال کا جواب وہ بس مسکرا کر دیتے تھے۔ زبان نے ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ دہلی میں اُن کا علاج ہوا۔ ناامید ہو کر انھیں پانی پت واپس لے آیا گیا۔ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء اور پہلی جنوری ۱۹۱۵ء کی درمیانی شب کو اردو کا یہ مایہ ناز ادیب و نقاد اور شاعر دو بجے اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملا۔ پہلی جنوری ۱۹۱۵ء کو دن کے دو بجے پانی پت میں مشہور صوفی درویش حضرت بوعلی شاہ قلندر صاحب کی درگاہ میں اس گوہر آب دار کو سپردِ خاک کر دیا گیا اور علم و ادب کا یہ روشن آفتاب لاکھوں سوگواروں کو روتا بلکتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا اور اپنے پیچھے جو حیات جاوید، یادگار غالب، حیات سعدی، مقدمہ شعر و شاعری جیسی لازوال نثری تصانیف

کے علاوہ نظم، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ کا بیش بہا خزانہ چھوڑ گیا:

آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

حالی کی موت کی خبر سن کر دنیائے علم وادب میں صف ماتم بچھ گئی۔ حالی کی موت محض ایک شاعر کی موت نہیں تھی بلکہ وہ عالم بے بدل تھے۔ ملک وملت کے سچے غم خوار اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار انسان تھے جو حد درجہ درمند دل رکھتے تھے۔ حقیقت میں حالی نیکی، اخلاق، مروت کے مجسمہ، فرشتہ صفت انسان تھے۔ وہ کئی علمی ادبی انجمنوں واداروں سے جڑے ہوئے فرد تھے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ان کا سوگ منایا گیا۔ تعزیتی جلسے ہوئے۔ ابھی شبلی کا غم تازہ تھا کہ حالی بھی داغِ مفارقت دے گئے۔ اقبال نے یہ شعر کہا:

شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستاں
حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد

شبلی وحالی کا غم مولانا احسن مارہروی اس طرح مناتے ہیں۔ اس مرثیے کے تین بند ملاحظہ ہوں:

سالِ پیوستہ ہجری میں رہی تھی اِک شب — کہ ہوئی شبلی مرحوم سے جنت سے طلب
عیسوی سال بھی ہونے لگا رخصت یونہی جب — دے گئے حالی مغفور غم رنج و تعب
نسبت یک جہتی کر گئے ظاہر دونوں
سال آخر کی طرح ہوگئے آخر دونوں

کوئی پوشیدہ و مخفی نہیں حالِ حالی — حال کے ساتھ ہے وابستہ مقال حالی
صورتِ بدر ہے رخشندہ کمال حالی — آج دنیا میں نہیں کوئی مثال حالی
دل ہے پژمردہ طبیعت میں بحالی نہ رہی
خاک رہتی کہ یہاں صورتِ حالی نہ رہی

اپنے اسلاف کے تصویر مجسّم وہ تھے — گو موخر تھے مگر فخر مقدم وہ تھے
کامل فن وہ تھے، استاد مسلّم وہ تھے — نالہ کش ہجری میں جن کے لیے ہیں ہم وہ تھے
آدمی ایک نہیں لاکھ نظر آئیں گے

مگر ایسے نہ بشر بار دگر آئیں گے

اس موقعے سے لسان القوم حضرت صفی مرحوم نے حالی کی موت پر جس غم کا اظہار کیا تھا، وہ بھی ملاحظہ ہو:

اس بزم میں آ کے جانے والا　　پھر جا کے اِدھر نہ آنے والا
کھوٹوں کو کھری سنانے والا　　اے قوم! تیرا جگانے والا
خاموش لحد میں سو رہا ہے
اور اُس کو زمانہ رو رہا ہے

حضرت صفی نے آخری بند میں تاریخ وفات نکالی تھی۔ وہ بھی ملاحظہ ہو:

دل خون کیا جب اس خبر نے　　آنسو برسائے چشم تر نے
دل سے درخواست کی جگر نے　　لکھی یہ صفی نوحہ گر نے
تاریخ وفات خواجہ حالی
ہستی حالی سے ہے اب خالی

یہ اور اس طرح کے متعدد مرثیے حالی کے غم میں کہے گئے اور ان کے اخلاق حسنہ اور ان کی تصانیف پر روشنی ڈالی گئی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حالی کی موت پر جس طرح آنسو بہائے گئے اس کی دوسری مثال ملنا مشکل ہے۔ حالی کی موت نے ہر چشم کو اشک بار اور ہر دل کو مغموم کر دیا:

مر گئے وہ تو زمانے نے بہت یاد کیا

مولانا خواجہ الطاف حسین حالی کی فاتحہ خوانی ۲۱ر فروری ۱۹۱۵ء کو پانی پت میں ہوئی جس میں ملک کے مشاہیر اور رہنمایان قوم شریک ہوئے۔ اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ حالی کی یاد میں کوئی یادگار قائم کی جائے۔ چونکہ حالی کا رشتہ تعلیم سے تھا اس لیے مسلم اسکول، جس کی بنیاد حالی نے رکھی تھی اسے ہائی اسکول تک کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ خواجہ سجاد حسین نے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں اپنے والد ماجد کی صد سالہ سال گرہ منانے کا فیصلہ کیا جس میں سر محمد اقبال، ڈاکٹر ذاکر حسین، رشید احمد صدیقی، سر سیّد راس مسعود، نواب صدر یار جنگ،

مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، نواب محمد اسماعیل خاں، سر اکبر حیدری، مولانا شوکت علی، حفیظ جالندھری، خواجہ حسن نظامی، خواجہ غلام السیدین، سر عبدالرحمٰن، جناب شعیب قریشی کے علاوہ ہز ہائینس نواب بھوپال نے بھی شرکت کی۔

سیرت

حالی کی سیرت اور اُن کے کردار پر تفصیل سے لکھنے سے قبل میں ان کے رفیق خاص بابائے اردو مولوی عبدالحق کے اس اقتباس کو پیش کرنا چاہتا ہوں:

> ''حالی ہماری قدیم تہذیب کا بے مثل نمونہ تھے، شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔ درگزر کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُن سے کیسے ہی بے معاملگی اور بدسلوکی کیوں نہ کریں، ان کے تعلقات میں کبھی فرق نہ آتا تھا اور نہ انھیں کسی بات پر غصہ آتا تھا۔ ان کے پرلے درجے کے نکتہ چیں جو دوسروں کی عیب گیری کیے بغیر مانتے ہی نہیں۔ ان کے ڈنک یہاں آکر گر جاتے تھے اخلاق اگر سیکھنے کی چیز ہے تو ایسے ہی پاک نفس بزرگوں کی صحبت میں آسکتے ہیں۔ آج بھی بہت سے صاحب علم و فضل ممتاز اسکالر ذی وجاہت، نیک سیرت، نیک دل اور پارسا لوگ موجود ہیں مگر افسوس کہ حالی جیسا نہیں۔
>
> مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری دردِ دل۔''
>
> (ڈاکٹر مولوی عبدالحق ۱۹۳۷ء)

حالی کی شرافت، نیکی، دردمندی، انکساری، خاکساری مشہور رہی ہے۔ کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حالی حد درجہ خداترس، نیک دل، غریب پرور، غمگسار، رحم دل، شریف النفس اور ایثار و خاکساری کے مجسمہ تھے۔ ان کی زندگی ایک روشن کتاب تھی۔ ایک مرتبہ حالی پانی پت میں تانگے سے کہیں جا رہے تھے، راستے میں دیکھا کہ

بھیڑ لگی ہے۔ کافی لوگ ایک نالے کے کنارے کھڑے ہیں۔ نالی میں بھنگی کا ایک بچہ گر گیا تھا جو کیچڑ اور گندگی سے پوری طرح لت پت تھا۔ لوگ رام رام کر رہے تھے۔ ناک پر رومال رکھے کھڑے تھے اور اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ بچہ بے حال اور بے چین تھا۔ حالی اس منظر کو دیکھ کر تڑپ اُٹھے۔ تانگے سے فوراً اترے۔ نالی سے بچے کو نکالا اپنے ہاتھوں سے اس کے کپڑے اُتارے۔ گندگی صاف کی اور اس کے ماں باپ کا پتہ پوچھ کر اس کے گھر تک پہنچایا۔ انھوں نے لوگوں سے کہا: ''جس رام کا نام آپ جپ رہے ہیں، اگر چاہتے تو اسی رام کا جلوہ اس ننھے بچے میں آپ کو نظر آ سکتا تھا۔'' ظاہر ہے اس بلیغ جملے کا خاطر خواہ اثر لوگوں پر پڑا۔ سبھوں کو شرمندگی ہوئی۔

حالی کنبہ پرور، پڑوسیوں، غریبوں کے سچے ہمدرد و غمگسار تھے۔ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ان کی تکلیفوں اور بیماریوں کو دیکھ کر تڑپ جایا کرتے تھے۔ فرید آباد کے قیام کے دوران ان کے مکان کے باہر کے کمرے میں ایک عورت وزیرن اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتی تھی۔ ایک رات وزیرن کا چھوٹا بچہ رات میں سخت بیمار ہو گیا رات بھر روتا رہا اس کے رونے بلکنے کی آواز سن کر حالی بے چین ہو اٹھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا۔ شدید سردی تھی۔ حالی کی عمر بھی ۷۸ سال کے قریب تھی، لیکن انھیں برداشت نہیں ہوا، وہ بستر سے اٹھ کر باہر آئے، وزیرن سے بچے کی خیریت دریافت کی اور بچے کے لیے ڈاکٹر کو بلانے کی بات کی۔ وزیرن نے روک دیا کہ صبح تک دیکھ لیا جائے۔ حالی نے وزیرن کو اس وقت تو تسلی دی لیکن خود بے چین رہے صبح ہوتے ہی ڈاکٹر لیاقت حسین کو وزیرن کے بچے کے علاج کے لیے بھیجا اور بچے کا بے حد توجہ سے علاج کرنے کو کہا اور خود برابر بچے کی خیریت دریافت کرتے رہے۔

حالی اپنے ملازموں نانوں خاں اور عطاء اللہ کا کس قدر خیال رکھتے تھے اس کے بیان کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہیں۔ مختصر یہ کہ وہ اپنے ان ملازموں کا حد درجہ خیال کرتے، ان پر کبھی غصہ نہیں کرتے، انھیں کبھی نہیں جھڑکتے۔ حالی کا خواہ کتنا ہی بڑا نقصان ان کے ہاتھوں ہو جائے، وہ اسے برداشت کرتے۔ اپنے ان ملازموں کے ساتھ ان کے

بچوں کا بھی بے حد خیال رکھتے یہ ان کی خیریت برابر دریافت کرتے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتے۔ نانوں خاں اور عطاء للہ اگر ان سے دور ہو جاتے تو خط کے ذریعے برابر ان کی اور ان کے بچوں کی خیریت دریافت کرتے۔ حتیٰ الامکان ان کی دل جوئی کرتے، اپنے بدن کے کپڑے اتار کر انھیں دے دیتے، ان سے اخلاق و محبت سے باتیں کرتے۔ ان کی تکلیفوں کو دیکھ کر خود رنجیدہ ہو جاتے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

مولانا حالؔی ۱۹۰۵ء میں حیدر آباد تشریف لے گئے تھے۔ اس زمانے کا ایک واقعہ مولوی عبدالحق بیان کرتے ہیں:

''ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک صاحب جو علی گڑھ کالج کے گریجویٹ اور حیدر آباد کے ایک معزز عہدے پر فائز تھے، مولانا سے ملنے آئے۔ ٹم ٹم پر سوار تھے۔ زینے کے قریب اترنا چاہتے تھے۔ سائیس کی جو شامت آئی تو اس نے گاڑی دو قدم آگے جا کر کھڑی کر دی۔ یہ حضرت ذرا سی چوک پر آپے سے باہر ہو گئے اور ساڑ ساڑ کئی ہنٹر اس غریب کے رسید کر دیے۔ مولانا یہ نظارہ اوپر برآمدے میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد وہ کھٹ کھٹ سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اُوپر آئے۔ مولانا سے ملے، مزاج پرسی کی۔ کچھ دیر باتیں کر کے رخصت ہوئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مولانا کا چہرہ بالکل متغیر تھا۔ وہ برآمدے میں ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے تھے۔ ہائے ظالم، کیا کیا، اس روز کھانا بھی اچھی طرح نہیں کھایا۔ کھانے کے بعد قیلولے کی عادت تھی وہ بھی نصیب نہ ہوا فرماتے تھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ ہنٹر کسی نے میری پیٹھ پر مارے ہیں۔ اس کیفیت سے جو کرب اور درد مولانا کو تھا وہ شاید اس بدنصیب سائیس کو بھی نہ ہوا ہوگا۔''

یہ اور اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جو حالؔی کی زندگی میں پیش آئے۔ اپنے خاندان، پڑوسیوں، دوستوں، شاگردوں، ملازموں، غریبوں، کمزوروں سبھوں کے ساتھ

حالی کا سلوک اور برتاؤ بے حد ہمدردانہ، والہانہ اور غمگسارانہ تھا۔ حالی کی شخصیت ایسی تھی کہ انھوں نے ہمیشہ دوسروں کی خوشی اور آرام کا خیال رکھا۔ ایک شب ایک صاحب اُن کے مہمان ہوئے۔ حالی نے اپنا کمبل اُنھیں دے دیا۔ دیر رات جب حالی ان کے پاس سے گزرے تو دیکھا کہ مہمان پیر سکوڑے سو رہے ہیں حالی کو احساس ہوا کہ انھیں ابھی سردی لگ رہی ہے۔ حالی نے اپنی گرم چادر بھی انھیں اوڑھادی۔ مہمان کو گہری نیند آ گئی اور وہ آرام سے سو گئے۔ حالی پوری رات ٹہلتے رہے۔ زبان پر اُف تک نہیں لائے۔ ایسے وسیع القلب، نیک دل، خداترس، مہمان نواز، انسان دوست ادیب کہاں ملتے ہیں؟ حالی کی پوری زندگی نیکی اور خداترسی سے عبارت ہے۔

○

نثر نگاری

اردو ادب میں حالی کی شناخت بحیثیت ایک نثر نگار کے نہایت ہی مستحکم ہے۔ حالی سے قبل اردو نثر کو جن ادیبوں و فنکاروں نے جلا بخشی اور اردو نثر کو عروج تک پہنچایا ان میں میر امن، مرزا رجب بیگ سرور، مرزا غالب، سر سید احمد خاں کے نام بطور خاص پیش کیے جاسکتے ہیں۔ حالی کے عہد میں محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی، پنڈت رتن ناتھ سرشار جیسے مشاہیر کی نثر کی اپنی مخصوص شناخت تھی۔ حالی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور اپنے مقالات، مضامین، کتابچوں کے علاوہ اپنی شاہکار تصانیف ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب''، ''حیات جاوید'' اور ''مقدمہ شعر و شاعری'' کی وجہ سے شہرت کی بلندیوں تک پہنچے۔ حالی کی نثر کے مطالعہ کے لیے ان کی نثر نگاری کے بتدریج ارتقا کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

حالی سے قبل اردو نثر میں رنگین بیانی، مبالغہ آرائی، شکوہ الفاظ، تصنع و تکلف کا زور تھا۔ نثر میں شاعری کی جارہی تھی۔ مسجع و مقفّیٰ نثر کو مقبولیت حاصل تھی۔ اس عہد میں حالی نے اپنی نثر کا ایک خاص اسلوب پیدا کیا، جس میں وضاحت، صراحت، متانت کے ساتھ ساتھ اعتدال اور توازن کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ استدلال پر بھی زور دیا گیا۔ حالی نے ان الفاظ کو بھی اہمیت دی جن الفاظ کو اس عہد کے ادبا و شعرا گھٹیا، عامیانہ اور ناقابل اعتنا گردانتے تھے۔ ان متروک الفاظ نے حالی کی نثر کو زور آور، واضح اور

دل نشیں بنانے میں بڑی مدد کی۔ حالی عربی و فارسی کے عالم اور انگریزی زبان کے رمز آشنا تھے۔ وہ اردو زبان کی روح کی گہرائی میں اتر کر اظہار کا وسیلہ تلاش کرتے تھے۔ حالی کو مقامی، علاقائی، ہندی زبان کے الفاظ پر قدرت حاصل تھی گویا یہ کہ ان کے پاس الفاظ کا بیش بہا ذخیرہ تھا اور اظہار کا مخصوص اسلوب، جس سے انھوں نے بخوبی کام لیا۔ موقع کی مناسبت سے وہ نثر میں تبدیلی کرنے کا ہنر بھی جانتے تھے۔ جہاں تنقیدی اور علمی معاملات میں وہ استدلالی، وضاحتی اور قطعیت سے پُر نثر لکھنے میں قدرت رکھتے تھے وہیں سوانح میں ادبی رنگ، شگفتگی، دل آویزی، روانی اور متانت کا خاص خیال رکھتے تھے۔

حالی سے قبل کی اردو نثر کا مطالعہ کیا جائے تو رنگیں بیانی کا ایک دفتر ملتا ہے۔ وہ دور طلسماتی، رومانی، قصوں کہانیوں اور داستانوں کا دور تھا۔ ان تخلیقات میں ظاہر بات ہے افسانویت کا غلبہ تھا اور سارا زور نثر کے حسن اور دلکشی پر صرف کیا جاتا تھا۔ اس عہد میں مذہبی تصانیف لکھنے کا بھی غالب رجحان تھا، جن کی نثر میں وضاحت اور استدلال کا ہونا لازمی ہے۔ اُس عہد میں سرسید، غالب، شبلی کی نثر کی مخصوص شناخت تھی۔ حالی نے ان سب سے الگ اپنا ایک منفرد راستہ خود بنایا، جس میں وضاحت، روانی، متانت، توازن اور سنجیدگی کو بنیادی اہمیت دی۔ اس کا بے حد خیال رکھا کہ جو نثر وہ لکھ رہے ہیں اس کے پڑھنے میں قاری کہیں الجھے نہیں اور ٹھوکریں نہیں کھائے۔ مسائل کا اظہار صاف و شفاف ہو، اور وہ مصنوعی آرائش و زیبائش و تصنع سے پاک ہو۔ حالی کی نثر کے یوں تو سبھی قائل ہیں مگر میں یہاں ڈاکٹر عابد حسین کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں جس میں انھوں نے حالی کی نثر کی خوبیوں کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

> ''حالی کی نثر بھی اپنے رنگ میں ان کی نظم سے کم نہیں، اس میں پختگی اور سادگی کی وہی شان پائی جاتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سلاست و روانی میں نثر کبھی نظم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خصوصاً وہ نثر جس میں علمی مضامین ادا کیے جائیں۔ پھر بھی ان کا اسلوب بیان اتنا سلجھا ہوا ہے کہ مشکل سے مشکل مسائل کو پانی کر دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ عملی متانت اور وقار کا دامن

ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔''

(بحوالہ یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، ص: ۲۱۷)

اس مقام پر اردو کے نامور ادیب ناقد آل احمد سرور کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے حالی کی نثر پر روشنی ڈالی ہے:

''ان کے جتنے رفیق اور ہم عصر تھے سب صاحب طرز تھے۔ لیکن زندگی صرف حالی کے طرز کو نصیب ہوئی۔ باقی یا تو ختم ہو گئے۔ یا ان کی کارفرمائی محدود ہو گئی۔ آزاد کی صناعی، نذیر احمد کا زور بیان، سرسید کی سادگی، شبلی کی رنگینی سب اپنی اپنی جگہ خوب ہیں لیکن آج نثر کا کیارجحان ہے۔''

(بحوالہ یادگار حالی، صالحہ عابد حسین، ص: ۲۱۷)

یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ بلا شبہ حالی اپنے عہد کے مقبول ترین نثر نگار تھے اور ان کی نثر کا دائرہ اس زمانے میں اور آگے چل کر آج تک اس قدر وسیع ہوا ہے کہ حالی کے عہد سے آج تک اردو نثر حالی کی نثر کی پیروی کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے اور حالی کی نثر کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔

حالی زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر و سخن اور نثر کی طرف راغب تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی وہاں مذہب کا غلبہ تھا۔ یوں بھی اس زمانے میں تعلیم صرف عربی و فارسی اور مذہبی علم حاصل کرنے تک کو ہی سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی اور انگریزوں سے حد درجہ نفرت تھی۔ حالی کی تعلیم و تربیت بھی علماء کرام کے زیر سایہ ہوئی اور حالی نے ابتدا میں مذہبی تصانیف پر توجہ کی۔ انھوں نے دوران طالب علمی ۵۳-۱۸۵۲ میں دینیات کے موضوع پر عربی زبان میں ایک کتابچہ لکھا تھا۔ یہ کتابچہ دراصل بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں کی تائید میں لکھا گیا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں وہابی مسلک کے حامیوں میں تھے اور انھوں نے اسلام مذہب اور اس مسلک کی تشہیر و تبلیغ میں پوری زندگی صرف کی اور انھوں نے متعدد کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں کے مخالفین نے ان پر جو الزامات لگائے تھے حالی نے ان کا منطقی جواب لکھا تھا۔ حالی کی یہ ابتدائی نثری کوشش

تھی۔ وہ اس کتابچے کو لے کر اپنے استاد مولوی نوازش علی کی خدمت میں پیش ہوئے۔ اپنے شاگرد کی لیاقت سے وہ متاثر ضرور ہوئے لیکن چونکہ اس کتابچے سے وہابی مسلک کی تائید ہوئی تھی اور اُس کی طرف داری میں یہ رسالہ لکھا گیا تھا اس لیے اس کتابچے کو ان کے استاد مولوی نوازش علی نے چاک کر دیا۔ اس واقعہ کا حالی کی ذات پر گہرا اثر پڑا اور انھیں یہ بھی سبق حاصل ہوا کہ مخالفت میں اس طرح کی کتاب لکھ کر انھوں نے استاد کی ناراضگی مول لی۔ حالی کی پہلی نثری تصنیف کا جو انجام ہوا اس کا گہرا اثر حالی کی ذات پر پڑا۔ ان کا قلم کافی دنوں تک خاموش رہا لیکن ایک ادیب اور عالم کے سینے میں اتنا مواد جمع ہو چکا تھا، جسے وہ تیزی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرنا چاہتے تھے۔

حالؔی کی دوسری تصنیف ''مولود شریف'' ہے ان کے بیٹے خواجہ سجاد مرحوم کے مطابق اس کی تصنیف ۱۸۶۴ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان ہوئی۔ اس کی عبارت مقفّیٰ اور دل کش ہے۔ اس میں انھیں روایات کو پیش کیا گیا ہے، جو بیشتر مولود شریف میں پیش ہیں۔ حسب مناسبت نظمیں، دعائیہ جملے، نثری مناجات بھی اس میں موجود ہیں۔ شاید حالؔی نے اس کی اشاعت مناسب نہیں سمجھی جسے بعد میں ان کے بیٹے خواجہ سجاد حسین نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا تو یہ کافی پسند کی گئی۔ حالی کی ایک اہم کتاب ''تریاق مسموم'' ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ اُس عہد میں عیسائی مبلغین اپنے مذہب کی تبلیغ و تشہیر میں سارا زور صرف کر رہے تھے۔ چھوٹے بڑے شہروں میں عیسائی مشنریاں حکومت برطانیہ کی سرپرستی میں تیزی سے کام کر رہی تھیں۔ یہ مشنریاں تقریر، تحریر، لٹریچر کی مدد سے اور جاہ و منصب کا لالچ دے کر عام ہندوستانیوں کو خواہ ان کا مذہب ہندو ہو یا اسلام اسے عیسائی بنانے میں بے حد زور صرف کر رہی تھیں۔ پانی پت بھی اس سے محفوظ نہیں تھا۔ پانی پت کے ملا سراج الدین کے دو بیٹے خیر الدین اور عماد الدین تھے۔ عماد الدین آگرہ گئے اور عیسائی مذہب کو قبول کر لیا۔ یہ شخص حد درجہ لالچی تھا۔ ظاہر بات ہے عیسائی مشنری میں اسے ملازمت مل گئی یہ پادری بن گیا اور خوش حال زندگی بسر کرنے لگا۔ عربی زبان پر عماد الدین کی اچھی دسترس تھی اس نے ''ہدایت المسلمین'' نام سے ایک کتاب لکھی۔ تذکرۂ حالی میں اسی کتاب کا نام ''تحقیق الایمان'' درج

ہے۔ بہر حال اس کتاب میں مذہب اسلام اور عیسائی مذہب کا مقابلہ اور موازنہ کیا گیا اور اسلامی تعلیمات پر بے حد سخت حملے کیے گئے۔ جس میں پادری عماد الدین نے بڑے معترضانہ جملے بھی لکھے۔ حالی ایک عالم تھے اور انھوں نے بے حد استدلال سے اس کتاب کا جواب ''تریاق مسموم'' کے نام سے لکھا جو دہلی کے رسالہ ماہنامہ ''خیر المواعظ'' میں قسط وار شائع ہوا۔ حالی نے اسلام مذہب کی تعلیمات، اس کی خوبیوں کو، اور تمام مذاہب سے یہ مذہب افضل کیوں ہے؟ اس پر روشنی ڈالی۔ بعد میں پادری عماد الدین کی کتاب پر مولانا محمد علی مونگیری اور دوسرے علماء کرام نے بھی جوابات لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا سب سے پہلا اور مدلل جواب حالی نے ہی لکھا جو اُن کی استدلالی نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

پادری عماد الدین کی شیطانیت کا دوسرا نمونہ تاریخ محمدی کے عنوان سے منظر عام پر آیا، جس میں اُس نے حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر چند بے حد رکیک، پست اور گھٹیا الزامات لگائے اور مذہب اسلام اور حضورؐ کی ذات پر زبردست اعتراضات کیے۔

خواجہ الطاف حسین حالی اسے پڑھ کر بے چین ہو اٹھے۔ اُنھوں نے اس کتاب کا عالمانہ و محققانہ جواب دیا۔ جو کتابی شکل میں ''تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے'' ۱۸۷۲ء میں شائع ہوئی۔ حالی کی دیگر تصانیف میں تذکرہ رحمانیہ، طبقات الارض، اصولِ فارسی، مجالس النساء، سوانح عمری حکیم ناصر خسرو، حیات سعدی، مقدمۂ شعر و شاعری، یادگارِ غالب، حیات جاوید، مضامین حالی، مقالات حالی وغیرہ بھی شامل ہیں۔

رسالہ ''شواہد الالہام'' ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ جس میں نبوت اور الہام کے حقائق کو مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ تذکرۂ رحمانیہ میں خواجہ الطاف حسین نے اپنے استاد گرامی حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ کی زندگی اور ان کے حالات کو درج کیا ہے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے محکمۂ تعلیم اور پنجاب یونیورسٹی کے لیے دو کتابیں ''طبقات الارض'' اور ''اصول فارسی'' بھی لکھیں۔ ''طبقات الارض'' دراصل فرانسیسی زبان میں ایک کتاب تھی جس کا عربی ترجمہ ایک مصری عالم نے کیا تھا۔ اس کتاب کا ترجمہ حالی نے اردو میں کیا جسے ڈاکٹر لائٹز کے زمانے میں یونیورسٹی نے شائع کیا اور یہ کتاب پنجاب کے اسکولوں

میں پڑھائی جانے لگی اور بے حد مفید ثابت ہوئی۔ اسی زمانے کی ایک دوسری کتاب ''اصول فارسی'' بھی ہے۔ جو محکمہ تعلیم پنجاب کے لیے لکھی گئی جو شائع نہیں ہوئی۔

حالی کی اہم نثری تصانیف میں پہلا نام ''مجالس النساء'' (۱۸۷۴ء) کا ہے۔ اس عہد میں ڈپٹی نذیر احمد کی شہرت عروج پر تھی۔ نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں عورتوں، بچوں، اور بچیوں کی تعلیم کو موضوع بناتے ہوئے دل نشیں انداز میں متعدد اہم ناول لکھے۔ ان کے علاوہ شاد عظیم آبادی اور مرزا عباس حسین ہوش نے بھی اصلاح معاشرہ اور تعلیم کے فروغ پر مبنی اپنے خیالات قصے کہانیوں میں پیش کیے۔ مولانا حالی نے اپنی اس کتاب ''مجالس النساء'' میں لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت پر زور دیا ہے۔ بعض ادباء کا خیال ہے کہ حالی نے یہ کتاب انگریز حاکموں کو خوش کرنے کے لیے لکھی اور اس میں جگہ جگہ ملکہ وکٹوریہ اور انگریزی زبان کی مدح کی گئی ہے۔ کرنل ہال رائڈ نے اس کتاب کے لیے چار سو روپے کے انعام کی سفارش کی تھی یہ انعام انہیں ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلس (جو بعد میں بادشاہ ایڈورڈ ہفتم ہوئے) کی دہلی آمد پر وائسرائے نورتھ بروک کے ہاتھوں عطا کیے گئے تھے اور یہ کتاب نصاب میں بھی داخل کی گئی۔ اس کتاب کو ناول کہنا مشکل ہے۔ چونکہ ناول کے فن کا جہاں تک تعلق ہے اس کی مکمل تعریف پر یہ کتاب پوری نہیں اترتی۔ یہ کتاب خاص اصلاح کے مقصد سے لکھی گئی تھی۔ حالی کا مقصد قصہ گوئی نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ یہ کتاب ناول کی صورت میں ۲۳۶ صفحات پر مشتمل دو حصوں میں لکھی گئی۔ کتاب میں باب کی جگہ مجلس لکھا گیا ہے۔ کتاب میں کل نو باب یا نو مجلس ہیں اور ہر باب میں عورتوں کی اصلاح پر زور دیا گیا ہے۔ بالخصوص علم کی اہمیت کیا ہے، کھیل کھیل میں بچوں کو اہم اخلاقی سبق کس طرح سکھائے جا سکتے ہیں۔ توہم پرستی سے کس طرح دور رکھا جا سکتا ہے۔ خانگی زندگی کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے، آپسی سماجی رشتے کس طرح خوشگوار رکھے جا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی سرسید کے خیالات و افکار اور انگریز حکومت کی برکتوں اور ان کے پھیلائے علم کی روشنی کی بھی حمایت و تعریف کی گئی ہے۔ کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ سرسید نے آسان اور سادہ زبان میں دہلی کی معاشرت کو بیان کیا ہے اور دہلی کی عورتوں کی

زبان، محاورے، کہاوتیں، مثلیں اور انداز گفتگو کے خصوصی طریقے کو پیش کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مقصدیت نذیر احمد کی طرح حالؔی کی اس کتاب کا بھی مرکزی عنصر اور جذبہ ہے مگر جو مکالمے اس کتاب میں موجود ہیں اس کے مطالعہ سے اس عہد کی تہذیب و معاشرت کی واضح تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اس کتاب میں حالی کی سادگی خلوص اور معصومیت کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

بلاشبہ حالی کی یہ کتاب ''مجالس النساء'' اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ حالؔی کے ذہن میں جو خیالات و افکار سرسید، انگریزوں اور مسلم معاشرے کے حوالے سے موجود تھے اسے انھوں نے بغیر کسی تکلف و تصنع کے من و عن، بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ افسانہ گوئی حالی کا ہرگز مقصد نہیں تھا۔ ان کی پوری توجہ اپنے مقصد، اصلاح معاشرہ پر تھی اور اس میں وہ کامیاب بھی نظر آئے ہیں۔ اس مقام پر یہ بات بغیر کسی جھجک کے کہی جاسکتی ہے کہ حالی جیسے شریف النفس اور قوم و ملت کے غم خوار انسان کا ہرگز مقصد انگریزوں کی خوشامد نہیں تھا۔ بلکہ وہ قوم کی بھلائی جن عناصر میں مضمر و پوشیدہ سمجھ رہے تھے۔ اسے انھوں نے موثر ڈھنگ سے پیش کیا۔

اردو نثر میں حالؔی کی سوانح عمریوں کی ایک خاص شناخت ہے۔ حالؔی نے حکیم ناصر خسرو علوی کے فارسی نسخے کی تحقیق و تدوین کی۔ یہ قلمی نسخہ دراصل نواب ضیاء الدین احمد خان لوہارو کے کتب خانے میں موجود تھا۔

حالؔی نے بڑی عرق ریزی اور جانفشانی سے اس وقت موجود سبھی تذکروں کے مطالعے کے بعد ۳۶ صفحوں میں حکیم ناصر خسرو کے حالات لکھے۔ اصل سفرنامہ ۱۳۶ صفحے پر مشتمل ہے۔ حالی نے حکیم شاہ کی سوانح لکھنے میں فرانسیسی فاضل چارلس شیفر کے مضمون کو بھی پیش نظر رکھا اور بے حد دِقّت نظر سے کتاب کو مکمل کیا۔

''حیات سعدی'' خواجہ الطاف حسین حالی کی وہ پہلی با قاعدہ نثری تصنیف ہے جس نے حالؔی کی شہرت میں چار چاند لگا دیا اور اردو سوانح نگاری میں ایک نئے باب کا اضافہ بھی ہوا۔ شیخ سعدی شیرازی فارسی کے مشہور شاعر اور فلسفی تھے۔ ان کو فارسی میں غزل کا پیغمبر مانا

گیا۔ انھیں ماہر اخلاقیات گردانا گیا اور فارسی میں ان کی دونوں کتابیں، گلستاں اور بوستاں کو جو شہرت حاصل ہوئی وہ بہت کم کتابوں کو حاصل ہوئی ہے۔ ہندوستان میں ہی کیا پورے برّصغیر میں سعدی کی اخلاقی حکایتیں اور سبق آموز قصے بے حد ذوق وشوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے ہیں اور نصاب میں یہ کتابیں شامل رہی ہیں۔ حالی کے مذہبی ذہن پر سعدی چھا گئے۔ سعدی نے بھی نصیحت، سادگی اور حقیقت کو اہمیت دی۔ سعدی نے مبالغہ آرائی، خوشامد، عشق و عاشقی، قصیدہ گوئی سے پرہیز کیا۔ حالی کا ذہنی رویہ بھی یہی تھا شاید یہی وہ نکتے ہیں جس نے حالی کو فارسی کے اس عظیم فلسفی، شاعر اور ماہر اخلاقیات مصلح الدین شیخ سعدی شیرازی کی سوانح حیات لکھنے پر مجبور کیا جسے حالی نے ۱۸۸۶ء میں مکمل کیا۔ سعدی کی مکمل و مبسوط سوانح عمری دو حصّوں میں ہے۔ پہلے حصے میں سعدی کے حالات ہیں اور دوسرے حصے میں ان کے کلام پر تبصرہ ہے۔ بعض ادباء کا خیال ہے کہ اردو میں سیرت نگاری کی سب سے پہلی کتاب ''حیات سعدی'' ہے۔ شبلی اور مولانا آزاد کو بھی یہ کتاب بے حد پسند تھی۔ اس کتاب کا دوسرا حصہ جس میں کلام پر تبصرہ ہے وہ اس کتاب کی معنویت میں اضافہ کرتا ہے۔ حالی نے سعدی کے کلام کے محاسن اور خوبیوں کو مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔ آخر میں شیخ سعدی کے حالات اور اس عہد کے دوسرے شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے۔ حالی نے شیخ سعدی کی زندگی کے مختلف گوشے اجاگر کیے ہیں اُن کی تصویر کشی اور کردار نگاری کا ایک رنگ ملاحظہ ہو:

> ''شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اس کے قویٰ کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرانوردی اور بادیہ پیمائی میں بسر کیا اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی...
>
> اس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ اس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین

کے برخلاف، ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈلا، یار باش، ہنسوڑ، ظریف، ریا اور نمائش سے دُور سیدھا سادا مسلمان تھا۔ اس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بہ تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر مشرق کے عام شعراء کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔

(حیات سعدی، مکتبہ جامعہ، نومبر ۱۹۷۸ء ص: ۴۱۔۲۴۰)

درج بالا اقتباس کی روشنی میں شیخ سعدی کے اوصاف اور حالی کی شیخ سعدی سے عقیدت و محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالی نے شیخ سعدی کی سوانح عمری لکھ کر اردو کے سرمایہ میں بلاشبہ اہم اضافہ کیا۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ ایران میں ہوا اور تہران سے شائع ہوا کیونکہ سعدی کی زندگی کے حالات پر اس سے قبل کوئی ایسی تحقیقی کتاب کسی دوسری زبان میں موجود نہیں تھی۔ مولوی عبدالحق نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ حالی کو شہد کی مکھی کی طرح کلام کے مطالعے سے ذرہ ذرہ چن کر سعدی کی سیرت اور اخلاق اور ان کے حالات کو ترتیب دینا پڑا۔'' ظاہر بات ہے کہ حالی نے جس خوش سلیقگی، تلاش و جستجو اور تحقیقی کاوش کے بعد سعدی کی سوانح کو پیش کیا ہے۔ اور اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے سعدی کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا اور سعدی کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے اس کے سبب حیات سعدی ایک بے مثال سوانح عمری کی حیثیت سے اپنا مقام متعین کرتی ہے اور حالی ایک سوانح نگار کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔

''یادگار غالب'' (۱۸۹۷ء) خواجہ الطاف حسین حالی کی وہ یادگار اور مہتم بالشان تصنیف ہے جس نے حالی و غالب دونوں کو سرخروئی عطا کی۔ حالی، غالب کے قدرداں اور ان کے عقیدت مندوں میں تھے۔ انھوں نے اپنی غزلوں کی غالب سے اصلاحیں بھی لیں اور غالب کے شاگرد قرار پائے۔ مرزا کے ساتھ انھوں نے کافی ایام گزارے اور ان سے بارہا ملاقاتیں کیں۔ حالی کی قربت غالب سے اس وقت اور بڑھ گئی جب حالی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے منجھلے صاحبزادے نقش بند خاں کے اتالیق اور شیفتہ کے مصاحبوں میں شامل ہو گئے۔ غالب

اور شیفتہ سے بے حد قربت تھی۔ دونوں میں اکثر ملاقاتیں رہا کرتیں تھیں، حالی بھی ان ملاقاتوں میں شامل رہتے۔ غالب کی شخصیت اور شاعری سے حالی بے حد متاثر تھے اور ان کے دل سے قدرداں تھے۔ غالب کے انتقال ۱۸۶۹ء کے بعد حالی نے جو مرثیہ لکھا تھا۔ شخصی مرثیوں میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی یہ مرثیہ مشہور و مقبول ہوا اور غالب سے حالی کا جو ایک خاص رشتہ تھا وہ بھی عیاں ہوا۔ اس مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا

اس مرثیے میں غالب کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف جس انداز میں کیا گیا ہے اور جن جذبات و احساسات کے سہارے اس مرثیے کو رقم کیا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اس مرثیے میں حالی کا فن عروج پر ہے۔ اسی نسبت کے تحت غالب کے قدردانوں اور حالی کے احباب کا یہ اصرار تھا، کہ حالی غالب پر ایک باقاعدہ کتاب لکھیں کیونکہ غالب کی شخصیت اور شاعری پر اس عہد میں کوئی ایسا مبسوط کام نہیں ہوا تھا۔ حالی نے مرزا کی تصنیفات، حالات، اخلاق و عادات پر کام کرنا شروع کر دیا اور یہ کتاب غالب کی پیدائش کے ایک سو برس پورے ہونے پر ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی۔ جس میں غالب کی شخصیت اور شاعری پر اس قدر علمی و تحقیقی کام انجام دیا کہ آج اس کتاب کی اشاعت کے ایک سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور غالب تنقید کے حوالے سے اس

کتاب کی حیثیت بنیادی ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں غالب کی سوانح اور ان کے اخلاق، عادات، اطوار، خانگی تعلقات کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں مرزا کے کلام پر ریویو اس کا انتخاب شامل ہے آخر میں قطعات و رباعیات اور مرزا کی نثر کے نمونے اور ان پر تبصرے شامل ہیں۔ دیباچہ میں حالی نے کتاب کی غرض و غایت کے تعلق سے لکھا ہے:

''اصل مقصود اس کتاب کے لکھنے سے شاعری کے اس عجیب و غریب ملکے کا لوگوں پر ظاہر کرنا ہے جو خدا تعالیٰ نے مرزا کی فطرت میں ودیعت کیا تھا، اور جو کبھی نظم و نثر کے پیرائے میں کبھی ظرافت اور بذلہ سنجی کے روپ میں کبھی عشق بازی اور رندِ مشربی کے لباس میں، اور کبھی تصوف اور حب اہل بیت کی صورت میں ظہور کرتا تھا۔''

(یادگار غالب، مکتبہ جامعہ اگست ۱۹۷۷ء ص:۱۶)

اس کتاب کے دوسرے حصے میں مرزا کے کلام کو چار قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ نظم اردو، نثر اردو نظم فارسی، نثر فارسی اور پھر ان پر مختصر تبصرے کیے گئے ہیں۔ مرزا کے فارسی کلام کا موازنہ ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام سے کیا گیا ہے۔ اور مرزا کی شاعرانہ حیثیت متعین کی گئی ہے۔ انتخاب کے حوالے سے حالی نے لکھا ہے:

''اس انتخاب سے جس کو مرزا کے تمام کلام کا نمونہ سمجھنا چاہیے کئی فائدے تصور کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ شعر کی سمجھ اور اس کا عمدہ مذاق رکھتے ہیں، ان کو بغیر اس کے تمام کلیات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہو، مرزا کا ہر قسم کا عمدہ کلام ایک جگہ جمع کیا ہوا مل جائے گا۔ دوسرے جو لوگ مرزا کا کلام اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے، وہ بہ سبب اس کے کہ ہر مشکل شعر یا فقرے کے معانی حل کر دیئے گئے ہیں، مرزا کے خیالات سے بخوبی واقفیت حاصل کر سکیں گے اور دونوں طبقوں کو معلوم ہو جائے گا کہ مرزا نے قوت متخیّلہ اور ملکۂ شاعری کس درجے کا پایا تھا۔ اور کس خوبی اور لطافت سے وہ نہایت نازک اور دقیق خیالات کو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں ادا

کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔

(یادگار غالب، مکتبہ جامعہ، ص:۱۹)

حالی کو مرزا غالب سے ایک خاص قربت تھی وہ غالب کے خارجی و داخلی معاملات سے بہت حد تک واقف تھے۔ مرزا کو اپنا استاد تسلیم کرتے تھے اور اسی لیے شخصیت اور شاعری دونوں حصّوں کے لکھتے وقت ان کی عقیدت مندی حائل نظر آتی ہے۔ وہ شخصیت کے حوالے سے خود کچھ بھی ایسا نہیں لکھتے ہیں جس سے غالب کی شخصیت پر آنچ آئے یا ان کی کوئی کمی یا برائی نمایاں ہو جائے، مرزا غالب کی خوش طبعی، بذلہ سنجی، اخلاق و عادات، درّا کی کے حوالے سے وہ تفصیل سے لکھتے ہیں اور مرزا کے کئی لطائف بھی انھوں نے درج کیے ہیں۔ حالی لکھتے ہیں:

''جیسی مرزا کی طبیعیت میں درّا کی اور ذہن میں جودت اور صورت انتقال تھی اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت ہی قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف کام کی بات کتاب میں نظر آجاتی تھی، ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاور، یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے۔ جن کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہیں۔''

(نقش حالی، نورالحسن ہاشمی، صفحہ ۳۶۹۔۳۷۰)

شخصیت اور ذہانت کے حوالے سے یہ اور اس طرح کے مختلف خیالات کتاب میں بکھرے پڑے ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے اس کتاب کا اہم حصہ وہ ہے کہ جس میں غالب کی شاعری پر حالی کے تبصرے شامل ہیں۔ جس میں انھوں نے اپنی بیجی تلی رائے دی ہے ساتھ ہی مرزا کے اسلوب و بیان اور جدت پر روشنی ڈالی ہے۔ مرزا کے اشعار کی مختصر تشریحیں پیش کی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یادگار غالب سے لے کر اب تک غالب تنقید کے حوالے سے

سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن بنیادی حیثیت آج بھی یادگار غالب کی ہی ہے اور بقول رشید حسن خاں:

''پچھلے پچاس برسوں میں مرزا صاحب کی شخصیت، اردو نثر اور اردو شاعری سے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اس کے باوجود سو برس زیادہ پرانی کتاب ''یادگار غالب'' کی اساسی حیثیت آج بھی برقرار ہے اس قول کے ساتھ اگر اس جملے کو شامل کرلیا جائے کہ مرزا صاحب کی فارسی نثر اور فارسی شاعری سے متعلق حالؔی نے جو کچھ لکھا تھا، اس پر ذرا سا بھی اضافہ نہیں کیا جاسکا ہے، تو بات مکمل ہو جائے گی۔''

(مضمون یادگار غالب، رشید حسن خاں مشمولہ الطاف حسین حالی، غالب انسٹی ٹیوٹ صفحہ ۱۹)

''حیات جاوید'' (۱۹۰۱ء) خواجہ الطاف حسین حالی کا وہ علمی و سوانحی کارنامہ ہے جس پر بلاشبہ سوانح نگار فخر کرسکتا ہے۔ سرسید سے حالی کا ایک قلبی رشتہ تھا۔ سرسید کے افکار و خیالات اور اعمال و افعال کے وہ حامی تھے۔ سرسید پر ان کے زمانے میں حد درجہ تنقیدیں کی گئیں اور لعن طعن کیا گیا لیکن سرسید دُھن کے پکّے اور عمل کے پختہ تھے۔ انھوں نے قوم کو پستی سے بلندی تک اٹھانے کا ارادہ کر رکھا تھا اور تعلیم ہی اس کی بنیادی کلید ہے۔ اس پر انھیں یقین تھا۔ معاشرے اور سماج کی بہتری اور بیداری کے لیے بھی وہ غور و فکر کرتے رہتے تھے۔ جدید تعلیم کی حمایت میں جب انھوں نے عملی اقدام اٹھائے تو ان پر طرح طرح کے الزامات عائد کیے گئے انھیں کافر اور ملحد بھی کہا گیا لیکن حالی جیسے بہت سارے ایسے بھی لوگ تھے جو سرسید کی نیت کی پاکیزگی کے قائل تھے اور مذہب اسلام سے سرسید کی محبت کے گواہ تھے۔ حالؔی نے سرسید کا بھرپور ساتھ دیا اور سرسید نے حالؔی کے ذہن و دل میں یہ بات بٹھادی کہ شاعری سے بڑے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اصلاح کی غرض سے شاعری ایک مؤثر ذریعہ ثابت ہوسکتی ہے۔ سرسید کے اصرار پر ہی حالی نے تاریخی شعری کارنامہ مدو جزرِ اسلام انجام دیا اور اصلاحی شاعری کی طرف راغب ہوئے۔ یہ صحیح ہے کہ غزل سے نظم کی طرف

رُخ موڑنے میں کرنل ہالرائیڈ اور محمد حسین آزاد نے بنیادی رول ادا کیا۔ لیکن حالی نے جس شدومد سے نظم کی تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا۔ تاریخی اعتبار سے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔

حالی کے زمانے میں سرسید کی شخصیت سب سے زیادہ متنازع فیہ تھی ان کے حامیوں کی تعداد مختصر اور مخالفین کی تعداد بڑی تھی۔ مخالفت زیادہ تر جذباتیت سے مغلوب تھی اور حمایت سرسید کے افکار سے متاثر ہوکر کی جارہی تھی۔ سرسید میں بڑی خوبیاں تھیں۔ تعلیمی میدان ہو یا معاشرے اور سماج کی بہتری۔ سرسید کی ان پر گہری نظر تھی۔ وہ اردو کے بلند پایہ نثر نگار اور اہم مصنفین میں تھے۔ وہ اعلیٰ منتظم، مفسر قرآن اور زمانے کے نبض شناس تھے۔ مسلم قوم کو جہالت اور اندھیرے غار سے باہر نکالنا ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ یہی باتیں حالی کو متاثر کرتی تھیں۔ اور سرسید کی زندگی میں ہی انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ سرسید کی سوانح عمری ضرور لکھیں گے اور سرسید کی زندگی سے ہی مواد کی فراہمی کا کام شروع کردیا۔ حالی خود علی گڑھ گئے۔ چند مہینے سرسید کے ساتھ قیام کیا اور جو کچھ معلومات حاصل ہوسکتی تھیں انھیں حاصل کیا۔ لیکن افسوس کہ سوانح عمری کے مکمل ہونے سے قبل سرسید کا ۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء کو انتقال ہوگیا اور ان کے انتقال کے بعد ۱۹۰۱ء میں یہ کتاب منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں چھ ابواب ہیں، جن میں سرسید کی ولادت خاندان بچپن، تعلیم اور عنفوان شباب کا ذکر ہے۔ ساتھ ہی ان کی زندگی کے تدریجی ارتقاء علمی، ادبی کارناموں کی تفصیلات کا مفصل بیان، اور ان کی وفات تک کی تفصیلات درج ہیں۔ دوسرے حصّے میں سرسید کی زندگی ان کی تصنیفات اور ان کے کاموں پر ریویو شامل ہے اور ان عادات و خصائل کا بھی ذکر ہے جو سرسید کو منفرد بناتی ہیں۔ مثلاً محنت و جفاکشی، محبت وصداقت، راست بازی، صحت جسمانی، مہمان داری، فراخ حوصلگی، توحید، رسالت اور حقیقت اسلام پر یقین بے تعصبی، اسلامی حمیت، اسباب دنیوی سے بے تعلقی وغیرہ وغیرہ اہم ہیں جن کا تفصیلی ذکر حالی کرتے ہیں۔ حیات جاوید کے دیباچے میں حالی لکھتے ہیں:

''اگر چہ ہندوستان میں ہیرو کا عیب وخطا کا معلوم ہونا اس کی تمام خوبیوں

اور فضیلتوں پر پانی پھیر دینا ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ کسی شخص کی بیا گرافی کرٹکل طریقہ سے لکھی جائے اس کی خوبیوں کے ساتھ اس کی کمزوریاں بھی دکھائی جائیں اور اس کے اعلیٰ خیالات کے ساتھ اس کی لغزشیں بھی ظاہر کی جائیں چنانچہ اسی خیال سے ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے۔ اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکیں ، ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ لیکن اوّل تو ایسی بیا گرافی چاندی سونے کے ملمع سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتی... لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے... ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیسے لکھی جا سکتی ہے ضرورت ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے۔

وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ سب سے پہلے اسی کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔''

(حیات جاوید، صفحہ:۳۸)

ظاہر بات ہے حالی سرسید کی زندگی میں ہی اس کتاب کو منظر عام پر لانا چاہتے تھے لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ وہ سرسید کے کھرے اور کھوٹے کو ٹھوک بجا کر دیکھنا اور پرکھنا چاہتے تھے۔ لیکن ایسا ہو نہیں سکا جس کا دعویٰ حالی کرتے ہیں وہ شاید سرسید کے انتقال کے بعد بھی ممکن نہیں ہو سکا۔ حالی ، علاق وضع داری اور رواداری کو ملحوظ رکھتے ہوئے سرسید کی خامیوں کو اجاگر کرنے سے قاصر رہے۔ ''حیات جاوید'' کے منظر عام پر آنے کے بعد اس پر پہلی تنقید شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی نے کی ، اور ''حیات جاوید'' کو سرسید کی یک رخی تصویر کہا اور اس انداز تحریر کو ''مدلل مداحی'' قرار دیا۔ یہ بات درست ہے کہ حالی نے سرسید کی یک

رخی تصویر پیش کی ہے۔ خود حالی سرسید سے کئی معاملات میں اختلاف رکھتے تھے اور ان کے ہم خیال نہ تھے لیکن چونکہ یہ سوانح سرسید کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔ اس لیے سرسید کی مکمل تصویر بلا کم و کاست پیش کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ حالی کے ہیرو سرسید تھے اور وہ اپنے ہیرو کو نمایاں کر کے پیش کرتے ہیں۔

''حیات جاوید'' پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ سرسید کی زندگی کو صحیح اور جامع انداز میں پیش نہیں کیا گیا جس کا دعویٰ حالی خود سوانح نگاری کے سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

''حیات جاوید'' کا دیباچہ ملاحظہ ہو۔ حالی لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ اور نہ اس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا۔ اور اس لیے ضروری ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ سچ میں اور صرف سچ میں یہ کرامت ہے کہ جس طرح اس میں کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔''

حالی درج بالا اقتباس میں جن باتوں کا دعویٰ کرتے ہیں اس پر خود ''حیات جاوید'' کی تصنیف میں کھرے نہیں اترتے۔ حالی کا اپنا ایک انداز ہے کہ وہ گلستاں میں پھولوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور کانٹوں کی تلاش نہیں کرتے۔

''حیات جاوید'' کی خصوصیت حالی کی بیانیہ نثر ہے جس میں کوئی جوش نہیں، کوئی جذباتیت نہیں، ایک سبک روی اور اعتدال ہے۔ وضاحت ہے اور صراحت ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک شاہکار ہے۔ حالی کی اِس طرح کی تحریر میں بھی خلوص سادگی صداقت اور یک رنگی ہے اور نثری آہنگ کی ایک شان ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاںؒ سے عقیدت رکھنے والوں کی کوئی کمی نہیں لیکن سرسید کی زندگی پر جو کام حالی نے کر دیا، وہ ناقابل فراموش ہے۔ حالی نے سرسید کی حمایت میں

مضامین بھی لکھے اور ان کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اصلاحی، مذہبی، نظمیں بھی لکھیں لیکن ''حیات جاوید'' ایک ایسا کام ہے جس نے سرسیّد کی حیات کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر دیا اور اردو سوانح میں اِسے شاہ کار کا درجہ عطا ہوا۔ بقول پروفیسر قمر رئیس:

> ''یہ حالی کا کمال ہے کہ انھوں نے سرسید کی ذہنی اور علمی سرگرمیوں کے ہر مظہر کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھا اور دکھایا۔ فن سوانح نگاری میں یہ حکیمانہ اور معروضی عمل حالی کے علاوہ کسی اور ادیب کے یہاں اس درجہ پر نظر نہیں آتا۔

(حیات جاوید، تاج پبلشنگ ہاؤس، مارچ ۱۹۷۶ء ص: ۲۸)

خواجہ الطاف حسین حالی کی ایک بے حد اہم کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ہے۔ حالی کا دیوان جب ۱۸۹۳ء میں شائع ہوا تو اس کتاب میں یہ مقدمہ بھی شامل تھا۔ اس مقدمہ نے اردو ادب و تنقید میں انقلاب برپا کر دیا۔ دراصل یہ پہلی کتاب ہے جس میں تنقید کے بنیادی اصول و ضوابط سے بحث کی گئی اور شعر کی ماہیئت و غایت زندگی سے اس کے تعلق اور سماجی اثرات پر مفصل گفتگو کی گئی۔ بلاشبہ یہ اردو تنقید کی پہلی کتاب ہے جس میں تنقید کے کچھ بنیادی اصولوں اور شاعری اور زندگی کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ شاعری کیسی ہو؟ اس کے اصول کیا ہوں؟ کن چیزوں سے شاعری میں کمال حاصل کیا جا سکتا ہے؟ شاعری کے لیے کون سی چیزیں ضروری ہیں؟ لفظ و معانی کا کیا رشتہ ہے؟ ایک اچھے شعر کی بنیاد کیا ہے؟ مرثیہ، قصیدہ، غزل کی کیا خصوصیات ہیں؟

یہ اور اس طرح کے متعدد نکات ایسے ہیں جن پر حالی نے قلم اٹھایا اور مفصل گفتگو کی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو اس کی سخت مخالفت بھی ہوئی۔ لیکن اس کتاب کو اردو تنقید کی پہلی کتاب تسلیم کیا گیا۔

اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں شاعری کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔ جب کہ دوسرے حصے میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیے کا ذکر ہے اور علمی تنقید کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔

حالی عربی، فارسی، اور اردو کے عالم تھے۔ قیام پنجاب کے دوران انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا انھیں بھرپور موقع ملا۔ جس سے وہ انگریزی ادب سے بھی واقف ہوئے اور یورپ میں شاعری سے جس طرح کام لیے گئے ہیں حالی کا اپنا ایک ذہن بنا اور انھوں نے مغربی مصنفین اور ناقدین کے افکار سے روشنی حاصل کی۔

حالی سے قبل اردو میں تذکرے کی روایت تھی اور ان تذکروں میں شعراء اپنے عہد کے شاعروں کے کلام اور ان پر تنقیدی آراء لکھا کرتے تھے ظاہر بات ہے تذکروں میں تفصیلات کی کمی ہوتی تھی اور پسند و ناپسند کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ تنقید کے لیے کوئی باقاعدہ اصول وضوابط متعین نہیں تھے تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو اردو شعراء کے یہاں بھی تنقیدی شعور کے متعدد نمونے ملتے ہیں اور تقریظوں و دیگر تحریروں میں تنقیدی جملے کہیں کہیں مل جاتے ہیں لیکن حالی نے تنقید کے لیے باقاعدہ اصول وضوابط طے کرنے کی کوشش کی۔ شاعری کے مختلف نکتوں پر تفصیل سے لکھا۔ مثلاً یہ کہ شعر جس قدر جہل و تاریکی کے زمانے میں ظہور کرتا ہے اسی قدر زیادہ رونق پاتا ہے۔ شاعری کا ملکہ بے کار نہیں ہے۔ شعر کی تاثیر مکمل ہے پالیٹیکل معاملات میں شعر سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ شخصی حکومت میں شاعری کی آزادی سے اس کو نقصان پہنچتا ہے خراب شاعری سے لٹریچر، زبان، اور سوسائٹی کو کیا نقصان پہنچتے ہیں۔ وزن کی شعر میں کس قدر ضرورت ہے قافیہ شعر کے لیے ضروری ہے یا نہیں؟ ان سب نکات پر گفتگو کرنے کے بعد حالی، شاعر کے لیے کیا کیا شرطیں ضروری ہیں اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ حالی تخئیل کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ کو شاعری کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ سب سے مقدّم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے قوت متخیّلہ یا تخئیل ہے۔ تخئیل کے حوالے سے حالی کی یہ رائے ہے کہ یہ قوت شاعر میں جس درجے کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجے کی ہوگی اور جس قدر یہ ادنیٰ درجے کی ہوگی۔ اس کی شاعری ادنیٰ درجے کی ہوگی وہ تخئیل کی تاریخ اور تفصیلات مع مثال پیش کرتے ہیں حالی شاعر کے لیے دوسری شرط کائنات کے مطالعے کو قرار دیتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ شاعری میں کمال حاصل کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کہ نسخۂ

کائنات اور سب سے خاص کر نسخۂ فطرت انسانی کا مطالعہ نہایت غور سے کیا جائے۔ حالی شاعر کے لیے تیسری شرط تفحص الفاظ کی بابت لکھتے ہیں کہ شعر کی ترتیب کے وقت اول متناسب الفاظ کا انتخاب کرنا اور پھر ان کو ایسے طور پر ترتیب دینا کہ شعر سے معانی مقصود کے سمجھنے میں مخاطب کو کچھ تردد باقی نہ رہے۔ ان کے علاوہ حالی آمد اور آورد میں فرق بھی بیان کرتے ہیں اور شعر میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیے اس کا اظہار کرتے ہیں۔

حالی اصلیت، جوش اور سادگی کو شعر کی بنیادی خوبی تسلیم کرتے ہیں۔ ملٹن کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہوا ہو۔ اور اصلیت پر مبنی ہو، اور پھر وہ سادگی، اصلیت، جوش کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔

حالی نے غزل، قصیدہ اور مثنوی پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بالخصوص غزل پر سخت اعتراضات کیے ہیں۔ وہ غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری قرار دیتے ہیں۔ حالی غزل کی انفرادیت کے بھی قائل ہیں ان کے مطابق اظہار کا کوئی آلہ غزل یا رباعی یا قطعہ سے بہتر نہیں ہوسکتا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ غزلوں کے دیوان سبھی لوگ شوق سے پڑھتے ہیں اور غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں۔ وہ غزل میں عشقیہ مضامین، شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر استعارے کے طور پر بیان کرنے کے حامی ہیں۔ غزل کو محض عشقیات میں اور عشقیات کو محض ہوا و ہوس کے مضامین میں محدود رکھنے کو مناسب قرار نہیں دیتے۔ حالی غزل کے تعلق سے اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ غزل کی حالت فی زمانہ نہایت ابتر ہے۔ حالی نے قصیدہ کی حالت کو بھی ناگفتہ بہ قرار دیا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ مرثیے میں ایک خاص قسم کی نمایاں ترقی کو دیکھ کر انھیں اطمینان ہوتا ہے اور وہ میر انیس کے مرثیوں کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دل سے داد دیتے ہیں۔ حالی کی نظر میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف مثنوی ہے کیونکہ ان کے خیال میں ہر بند میں کسی بھی نکتے کا عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے۔

حالی کی یہ کتاب مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) میں جب منظر عام پر آئی تو ظاہر بات ہے کہ اعتراضات اور مخالفتوں کے دریا بہنے لگے۔ اور سب سے زیادہ اعتراض اس

نکتے پر بھی کیا گیا کہ حالی کی مغربی تنقید کا مطالعہ مستحکم نہیں ہے۔ خواہ وہ کلیم الدین احمد ہوں، احسن فاروقی یا وحید قریشی۔ بہر حال حالی نے مغربی تنقید کا مطالعہ کیا تھا لیکن ان کی بنیاد مشرقی شعریات پر ہی قائم ہے حالی نے شعر شاعر، غزل، مثنوی، قصیدہ، لفظ و معانی کا رشتہ ان سب پر جو کچھ بھی لکھا اس سے اختلاف کی بہت حد تک گنجائش ہے لیکن یکسر ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

حالی پر سب سے سخت تنقید کلیم الدین احمد کرتے ہیں کلیم الدین احمد کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

> ''حالی خیالات تو اخذ کر لیتے ہیں لیکن ان پر کافی غور و فکر نہیں کرتے ان کی جانچ پڑتال نہیں کرتے اور یہ بھی نہیں سمجھتے کہ بعض باتوں میں تضاد ہے۔ شاعری کے لیے جو شرطیں حالی ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی سطحی اور کورانہ طور پر اخذ کی گئی ہیں۔ ان جملوں میں بھی سطحیت ہے، حقیقت سے بے خبری ہے، حالی کی حیثیت شاعر کی نہیں تماشائی کی ہے۔ یہ جملہ بھی لا علمی کا بھید طشت از بام کر دیتا ہے۔ خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم و ادراک معمولی، غور و فکر نا کافی، تمیز ادنیٰ، دماغ و شخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کائنات۔ یہ تو روشن ہے کہ حالی کی واقفیت محدود تھی اور نظر بھی سطحی تھی اسی وجہ سے مقدمے میں بہت سی غلط بیانیاں ہیں اور بہت سی چیزوں کو غلط اہمیت دی گئی۔''

کلیم الدین احمد بھی جذبات سے مغلوب ہو کر اپنی رائے کو پیش کرتے ہیں جس زمانے میں حالی نے یہ کتاب لکھی اس عہد میں تنقید با قاعدہ ایک علم کی صورت میں سامنے نہیں آئی تھی۔ حالی کے خیالات مشرقی ہوں یا مغربی۔ انھوں نے مغربی ادیبوں و ناقدین کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا ہو یا نہیں۔ اتنا تو طے ہے کہ حالی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ان نکتوں پر غور و فکر کیا اور غور و فکر کے بعد ایسے خشک موضوعات پر قلم اٹھائے مسئلہ خواہ آمد یا آورد کا ہو یا پھر غزل کے بہتے دریا پر روک لگانے کا۔ حالی نے بدلتے ہوئے منظر نامے پر نظر

رکھی اور پھر ایک فیصلہ کن رائے دی۔ ان کی رائے سے اختلاف کی گنجائش بہر حال ہے۔ سادگی، اصلیت، جوش ہی محض عمدہ شعر کی خصوصیات نہیں ہیں یا پھر شاعر بننے کے لیے تخئیل، مطالعہ کائنات اور الفاظ کی ہی ضرورت نہیں پڑتی ہے بلکہ بہت سارے نکات ایسے ہیں جن پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر اتنا تو طے ہے۔ کہ پہلی بار حالی نے ان مسائل پر سوچا اور وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال اس سے پہلے کوئی دوسری نہیں ملتی اور بقول آل احمد سرور:

> ''حالی سے پہلے ہماری شاعری دل والوں کی دنیا تھی۔ حالی نے مقدمہ شعروشاعری کے ذریعہ اسے ایک ذہن دیا۔ بیسویں صدی کی تنقید حالی کی اسی ذہنی قیادت کے سہارے ابھی تک چل رہی ہے۔
>
> (فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، نورالحسن ہاشمی، ص: ۱۱۵)

مقدمہ شعروشاعری حالی کا وہ علمی وتنقیدی اور نثری کارنامہ ہے جس نے اردو تنقید کی راہ کو متعین کرنے میں ایک خاص سمت دی۔ تنقید کے آداب سکھائے اور تنقید کو ایک مخصوص زبان عطا کی۔ جس میں جذباتیت، لفاظی، خیال آرائی کو بے دخل کر کے قطعیت، وضاحت، صراحت، استدلال اور توازن کو جگہ دی۔ بلا شبہ حالی کے بعد اردو تنقید اسی ذہنی قیادت کے سہارے اپنی منزلیں طے کر رہی ہے۔

○

شاعری

متاع بے بہا ہے شعر حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری سے دنیا کی اخلاقی طہارت کا کام لینا فرض اولین سمجھا۔ حالی کا عہد سیاسی اعتبار سے انتشار کا عہد تھا۔ انگریزوں کی جابرانہ و آمرانہ نظام حکومت سے ہندوستانی عوام کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھنے کو تیار تھی۔ حالی کی عمر جب بیس برس تھی تو ہندوستان کی جنگ آزادی کی پہلی لڑائی ۱۸۵۷ء میں لڑی گئی۔ سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار کا زوال ہو گیا تھا۔ اور انگریز پوری طرح ہندوستان میں قابض و دخیل ہو گئے تھے۔ اس انقلاب کا اثر شعر و سخن پر بھی پڑا۔ حالی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھنوی شاعری کا زور تھم رہا تھا۔ لفظی کاریگری اور محاوروں سے مزا لینے کا رواج کمزور پڑ رہا تھا۔

اس انقلاب نے شعرا و ادبا کے ذہن و دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سماجی، سیاسی، مذہبی اصلاح پسندی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ حالی کا جو خاندانی علمی و مذہبی پس منظر ہے اس میں بھلا وہ کیوں کر ان اثرات سے دور اور محفوظ رہ سکتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم قدیم رواج کے مطابق خالص مذہبی طریقہ سے ہوئی تھی۔ حالی نے عربی و فارسی زبان و ادب کا مطالعہ کیا۔ حافظِ قرآن ہوئے۔ مشہور عالموں سے کسب فیض کیا اور جب علم کی پیاس بجھانے کے لئے پیدل چل کر پانی پت سے دہلی آئے تو ان کی ملاقات غالب و شیفتہ سے ہوئی، جن

کی صحبت نے حالی کی فکر اور شاعری کو خاصا متاثر کیا۔ بعد میں سرسید کی رفاقت نے انھیں قومی وملّی شاعری کی طرف مائل کیا۔

حالی کی پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی، جس خمیر کے سائے میں وہ پروان چڑھے، انقلاب ۱۸۵۷ء نے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ انھوں نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے مختلف صنف سخن پر طبع آزمائی کی البتہ صنف نظم پر بطور خاص توجہ دی اور غالب وشیفتہ کی صحبت کا اثر اور عام روایت کے مطابق انھوں نے صنف غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔ اس باب میں حالی کی شاعری کے مطالعے کے لئے اسے غزل، نظم، مثنوی اور رباعی میں تقسیم کیا گیا ہے۔

حالی کی غزلیں

صنف غزل کے تعلق سے حالی نے اپنے جن خیالات کا اظہار مقدمہ شعروشاعری میں کیا ہے اُس سے ہم بھی بخوبی واقف ہیں۔ چند نکات سے یقیناً اختلاف کی گنجائش ہے۔ مثلاً یہ کہ حالی نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ غزل میں اگر مخرب اخلاق اشعار ہوں تو اس سے سوسائٹی کے اخلاق خراب ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ حالی نے غزل کی اصلاح کے سلسلے میں چند بیش قیمت رائیں بھی پیش کی ہیں جنھیں یکسر نظر انداز کر دینا قطعاً درست نہیں مثلاً یہ کہ نئے نئے اسلوب بیان تخلیق کر کے غزل کو مالا مال کرنا چاہیے، قدما کے کلام سے استفادہ کرنا چاہئے، اُن کے نادر پہلوؤں کی تلاش کرنی چاہیے، شاعر ہر اُس کیفیت اور خیال کا اظہار کرے جس کا ورود اُس کے دل پر ہو، قدما کے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات وتشبیہات واستعارات وغیرہ ذخیرے سے استفادہ کر کے اپنے خیالات کو ان پیرایوں میں ادا کرنا چاہیے۔ اس مقام پر میں حالی کی ایک نہایت ہی دلچسپ نظم ''شعر کی طرف خطاب'' پیش کر رہا ہوں، جس سے حالی کے نظریۂ شعر کی وضاحت ہوتی ہے:

اے شعر دل فریب نہ ہو تُو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو

صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں — تحسین روزگار سے ہے بے نیاز تو
وہ دِن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری — قبلہ ہو اب اُدھر تو نہ کیجو نماز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جادِلوں میں گھر — اُونچا ابھی نہ کر علَمِ امتیاز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا — محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا — اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دُنیا، تو لے نکل — بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے، اپنا جہاز تو
ہوتی ہے سچ کی قدر، پہ بے قدریوں کے بعد — اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تُو

جو قدر داں ہو اپنا اسے مغتنم سمجھ
حالؔی کو تجھ پہ ناز ہے کر اس پہ ناز تُو

حالی کی نظر میں شعر کا دلگداز، سادہ، سچا ہونا لازمی ہے ان کا یہ خیال ہے کہ اس راستے پر چل کر ہی اس کی عمر دراز ہو سکتی ہے۔ اس روشنی میں حالی کی غزلوں کا مطالعہ کیا جانا لازمی ہے۔ اُس عہد کے سیاسی و سماجی منظر نامے اور اپنی تہذیب و تمدن پر پڑنے والے اثرات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ حالی کی غزلوں کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے قدما کی شاعری سے استفادہ تو کیا لیکن طرز کہن پر قائم نہیں رہے۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ انھوں نے نئی بوتلوں میں پرانی مشروبات کو بڑے سلیقے سے پیش کیا۔

سخن میں پیروی کی گر سلف کی
اُن ہی باتوں کو دہرانا پڑے گا

حالی کا شعری ذوق فطری تھا۔ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا شعر و سخن میں اُن کی دلچسپی روز بروز بڑھتی ہی رہی۔ اُن کا ذہن و دل جس سانچے میں پلا بڑھا اور پروان چڑھا تھا۔ اس میں اصلاحی جذبات کا پنپنا لازمی تھا۔ گو غالب و شیفتہ کی صحبت سے یقیناً ان کے فکر و احساس میں تازگی پیدا ہوئی مگر حالی نے اپنے عہد کے دیگر تمام شعرا سے الگ اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔

تم تو حالؔی یہی طرز اپنی نبا ہے جاؤ
طرز شعر فصحا و بلغا اور سہی

حالی اپنی شاعری کو انسانی جذبات واحساسات کا ترجمان بنانا چاہتے تھے۔ اُن کی شاعری کا مطالعہ تین حصوں میں تقسیم کر کے کیا جا سکتا ہے۔ حالی کی غزلوں کا پہلا حصہ قدیم غزلوں پر مشتمل ہے جو ایام جوانی میں لکھی گئیں اور اس کا دور ۱۸۷۴ء تک کا ہے اس زمانے میں حالی دہلی میں مقیم تھے۔ مرزا غالب کی صحبت تھی اور دہلوی شعرا کا رنگ اُن پر حاوی تھا۔ جہاں رندی اور سرمستی، روایتی حسن وعشق کے قصّے پائے جاتے ہیں۔ پند ونصائح، شیخ وزیاد پر طنز دیر وحرم کا ذکر ان غزلوں میں موجود ہے۔ ساتھ ہی وارداتِ قلبیہ، داخل میں سلگتی ہوئی دھیمی دھیمی آنچ کی تپش بھی اُن کے اِس عہد کے اشعار میں موجود ہیں:

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہوگیا

تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں

اک عمر چاہیے کہ گوارہ ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

جو دل پہ گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح!
کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر تو نے کہا ہوتا

رنج اور رنگ بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رُسوائی کا

آگے بڑھے نہ قصۂ عشق بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم

خود رفتگی شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم

ان اشعار میں عشقیہ جذبات اور داخلی احساسات وواردات کا واضح اظہار موجود ہے۔ سوز و گداز اور دردمندی کے عناصر بھی نمایاں ہیں۔ اسی ضمن میں چند اشعار مزید ملاحظہ ہوں، جن میں لذت عشق بھی ہے، جادونوائی بھی اور رنگین بیانی بھی۔ غزل کا حسن بھی اور شیریں لب ولہجہ بھی:

ہوتی نہیں قبول دُعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دُشمن دیں مہرباں ہے اب

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تُو مگر کہاں

وفا شرط اُلفت ہے لیکن کہاں تک
دل اپنا بھی تجھ سا ہوا چاہتا ہے

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

تقاضائے محبت ہے وگرنہ
مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو

حالی کے ان اشعار کو پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے حیرت ضرور ہوتی ہے لیکن حالی بھی تقاضائے بشری سے دامن محفوظ نہیں رکھ سکتے تھے۔ دلّی کا شعری و ادبی ماحول، غالب و شیفتہ کی صحبت، قدیم و جدید ادب و شاعری کے مطالعے اور ذوقِ شعری نے حالی کو غزل کی رعنائی و دلکشی میں جذب کر دیا۔ حالی کے مطابق:

> ''شیفتہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانا اسی کو منتہائے کمال شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے... ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔''
> (تذکرۂ حالی، اسماعیل پانی پتی، بحوالہ نقش حالی، نورالحسن ہاشمی، ص:۱۶۶)

اس کا اظہار حالی شعر میں یوں کرتے ہیں:

حالیؔ سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالبؔ کا معتقد ہے، مقلد ہے میرؔ کا

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ ان خیالات کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ:

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفیؔ و میرؔ کر چکے

شیفتہ کا اثر حالی کی شاعری پر کس قدر پڑا اس کا اندازہ لگانے کے لیے درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

رات ان کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم
ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اس میں زیاں ہے اب

محاورات کا برجستہ استعمال، حسن بیان اور بیان کی دلفریبی کا احساس ان اشعار کو پڑھتے ہی ہو جاتا ہے۔ لیکن میری ذاتی رائے یہ کہ حالی کی غزل پر جس شاعر کا اثر حد درجہ پایا جاتا ہے وہ مومن ہیں۔ حالیؔ کے بعض اشعار انداز بیان میں مومن کے اشعار سے اس قدر قریب ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ مومن نے عشقیہ معاملات کو اپنی شاعری میں بخوبی برتا ہے۔ جب کہ حالی کے صوفیانہ خیالات اور افکار تھے۔ مگر مومن کی شعری حدّت حالی کے

سینے کو چیر کر اس میں سما جاتی ہے۔ ذرا ان اشعار کو ملاحظہ فرمائیں:

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو دعا میں اثر کہاں

تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا

مجھ میں وہ تابِ ضبط شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم، کہ میرے بھی منھ میں زباں ہے اب

کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں
دھرا کیا ہے اشارات نہاں میں

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

مومن کی شوخی اور چھیڑ چھاڑ بھرے لب و لہجے کی آگ سے حالؔی اپنی غزل کے دامن کو بچانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ حالی کی پارسائی، سنجیدگی اور متانت انھیں روکتی بھی ہے لیکن اس وادیٔ عشق و تعشق میں جب ان کے قدم پڑ جاتے ہیں تو وہ اس کے بہاؤ میں بہتے ہوئے دور تک چلے جاتے ہیں اور چند یادگار غزلیں ان ہی پلوں میں جنم لیتی ہیں۔

قدیم روایات کا حالی حد درجہ خیال و احترام کرتے ہیں اور نصیحت آمیز باتیں وہ خود نظم و نثر میں بیان کرتے ہیں لیکن غزل کے تقاضے کے سامنے اکثر وہ خود سپر ڈال دیتے ہیں اور جب جہاں انھوں نے شعوری طور پر مقصدیت سے پُر شاعری کی کوشش کی وہاں وہاں ایک بے کیفی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ حالی کی ایسی ہی ایک غزل ملاحظہ ہو:

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا
یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو! کہاں تک یہ آتش مزاجی
تمہیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کا
بس اب دل سے شکووں کو دھونا پڑے گا
بن آئے گی ہرگز نہ یاں کچھ کیے بن
جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا

ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

اس طرح کی بے لطف و بے نمک غزلوں کی تعداد ان کے یہاں خاصی ہے۔ حالی جب جب ناصح و مبلغ بنے ہیں۔ ان کی غزلوں کا لطف جاتا رہا اور وہ غزلیں پند نامہ بن کر رہ گئیں۔ جہاں ان کی روش آزاد رہتی ہے ان کے اشعار تاثیر اور لطف سے خالی نہیں ہوتے۔ شیخ و زاہد کی پارسائی پر ان کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

جن کے معبود حور و غلماں ہوں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیّار ہے وہ
اس کی صورت میں تو ایسا نہیں پایا جاتا

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

جھگڑوں میں اہل دین کے حالی پڑیں نہ آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

مان لیجیے شیخ جو دعویٰ کرے
اک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا

گو مے ہے تند و تلخ، پہ ساقی ہے دل رُبا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ، ہاں کیے بغیر

عقل کی بات کوئی ہم نے کہی ہے شاید
جنّتی جتنے ہیں، سب ہم سے حذر کرتے ہیں

درج بالا اشعار میں بیان کی لطافت بدرجہ اتم ہے جس میں شیخ وزاہد پر گہرا طنز کیا گیا ہے اس طرح کے متعدد اشعار حالی کی غزلوں میں موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حالی کی غزلوں کے دو ابعاد، رخ ہیں۔ ناصحانہ اور عام غزل کی روایت۔ ناصحانہ غزلوں کو زمانے نے قبول نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حالی نے نظموں کا انتخاب کیا اور اپنی نظموں میں وہ اپنے جذبات واحساسات اور خیالات کا اظہار برملا وسیع کینوس میں بیان کرتے ہیں۔ نظم کے علاوہ انھوں نے مثنویوں اور مرثیوں پر بھی توجہ دی اور حالی کی خاص شناخت قائم ہوئی۔ مگر جہاں تک عام غزل کی روایت کا معاملہ ہے حالی کی غزلوں میں عامیانہ پن اور سطحیت نہیں ہے۔ قدیم روایتوں کا احترام ضرور ملتا ہے۔ ان کا انداز بیان سادہ، عام فہم اور سلجھا ہوا ہے۔ اس کا مطالعہ ہم یوں بھی پیش کر سکتے ہیں کہ حالی نے ابتدائی دور میں روایتی غزل کی طرف توجہ دی۔ جس میں کوئی مقصد پوشیدہ نہیں تھا۔ لیکن جدید رنگ تغزل میں جب انھوں نے شاعری شروع کی تو مقصدیت، نصیحت، پند وموعظت، اخلاق واصلاح سے ان کا رشتہ قائم ہو گیا اور حالی کی غزل گوئی کی بنیادی شناخت اسے ہی قرار دیا گیا۔ آخری دور میں حالی کی غزلوں میں زندگی کی تنقید پر زیادہ زور ملتا ہے۔ لیکن اتنا تو طے ہے کہ حالی اردو غزل کی تاریخ میں لب ولہجہ کی نرمی، سوز وگداز، روایتوں کے احترام، نئے خیالات، اخلاقیات، معرفت وحقیقت کے بیان، طنز ومزاح، دل کش اور انفرادی رنگ تغزل اور غزل مسلسل کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ شجاعت علی سندیلوی کا یہ خیال توجہ طلب ہے کہ:

> ''حالی نے تنگنائے غزل کو وسعت بخشی۔ اس کو نئے مسائل اور نئے حالات سے روشناس کیا۔ اسے عشق وحسن اور ہوا وہوس کے دائرے سے

نکال کر اس قابل بنایا کہ وہ سیاسی وسماجی، قومی وملکی حالات پر تبصرے، تعیش وتکبر کی مذمت، غلامی ومحکومی سے نفرت، حق گوئی اور آزادی سے محبت، ادب واخلاق اور تعلیم وتہذیب کا ذکر، صبر وضبط اور ہمت و استقلال کی ترغیب، مذہب و تصوف اور پندوموعظت کا بیان، ریاکار عابدوزاہد اور شیخ وواعظ پر طنز اس انداز سے کر سکے کہ صداقت وواقعیت، خلوص ومحبت اور رنگ تغزل قائم رہے۔''

(حالی بحیثیت شاعر، شجاعت علی سندیلوی، ص:۱۹۳)

جب کہ فراق گورکھپوری کا یہ خیال ہے:

''ان کی غزلوں کی چٹیلی نثریت، ان کی رُکی رُکی سی تلملاہٹ، ان کا احساس خلوص، ہلکی سی طنز وتلخی لیے ہوئے ان کے تیور، زندگی اور واقعاتِ زندگی سے ان کا قرب، ان میں اصلیت کا عنصر ان کا اعتدال وتوازن، عقل کے ناخن سے شعور انسانی کو چھیڑنا، کبھی کبھی ان میں ایک اکھڑ پن اور کھردراپن عموماً ان کا نرم اور دبادبا ترنم یعنی ان میں تحت النغمگی کی صفت، ان کی متین ومہذب بذلہ سنجی، ان کی روک تھام اور لیے دیے ہوئے انداز میں کہنے کی بات کہہ گزرنا، عشق کا پاکیزہ معیار، جذبات انضباط، حسین سے حسین جھوٹ سے احتراز... اس چھچھورے پن سے جسے فنکارانہ شوخی وطراری سے دلکش بنانے کی کوشش کی جاتی ہے ان کا پاک وصاف ہونا، یہ حالی کے تغزل کی وہ صفات ہیں جو اسے چوٹی کے متغزلین میں جگہ دیں یا نہ دیں، لیکن جو حالی کو ایسا غزل گو ضرور بنا دیتے ہیں کہ چوٹی کے غزل گو اس کی عزت کریں۔''

(بحوالہ: حالی بحیثیت شاعر، شجاعت علی سندیلوی، ص:۱۹۳)

یہ حقیقت ہے کہ حالی کی بنیادی شناخت ایک نظم گو شاعر کی ہے لیکن انھوں نے غزل کے سرمایے میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ حالی نے اپنی غزلوں میں عشق سے زیادہ اخلاقی

اقدار پر زور دیا۔ شاید اِسی لیے اُن کے یہاں جذباتی وفور اور شدت احساس کی کمی پائی جاتی ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ حالی کی غزلیں واردات عشق اور داخلی جذبات کے سلگنے کی تپش سے بالکل دُور ہیں۔ حالی اکثر اپنے داخلی جذبات، دلی واردات اور کیفیات کا اظہار اپنے مخصوص لطیف پیرائے میں کرتے ہیں۔

حالی مبالغہ سے گریز کرتے ہیں۔ اُن کے لہجے میں ایک خاص ٹھہراؤ دھیما پن اور نرمی ہے۔ وہ الفاظ کا انتخاب واستعمال بے حد احتیاط سے کرتے ہیں۔

حالی کی زندگی پریشانیوں اور اُلجھنوں سے بھری رہی۔ وہ زندگی کی کڑی دھوپ اور تپتے ریگستانوں میں ننگے پیر چلتے رہے۔ اُن کی کلفتوں کے نشانات اُن کی غزلیہ شاعری میں جا بجا ملتے ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی غزل گوئی سے بھی دنیا کی طہارت کا کام انجام دینے کی کوشش کی۔ اس اصلاحی جذبے نے اُنھیں پوری طرح نظم کی طرف موڑ دیا کیونکہ ان کے مقصد کی تبلیغ کے لیے نظم کا کینوس زیادہ موزوں تھا۔ انھوں نے اس صنف کو قبول کیا اور حالی نظم گو شاعر کی حیثیت سے ہی مقبول و معروف ہوئے، لیکن بحیثیت غزل گو بھی ان کی شناخت مستند ہے۔

حالی کی نظم نگاری

انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہندوستان کے شعر و سخن پر گہرا اثر ڈالا۔ ملک کے سیاسی و سماجی منظر نامے میں تیزی سے تبدیلی ہو رہی تھی۔ ایک طرف جہاں انگریز حکمرانوں کے اقتدار کے پنجے میں ہندوستانی عوام جکڑتے جا رہے تھے اور انگریز پوری طرح ملک پر اپنا تسلط قائم کر چکے تھے، وہیں دوسری طرف ہندوستانی عوام میں دو طبقے اُبھر کر سامنے آئے۔ ایک طبقہ وہ تھا جو انگریزوں کے ظلم و ستم کے زیر سایہ خاموشی سے زندگی سے فرار اختیار کر چکا تھا۔ اُن کی زندگی مایوسی، افسردگی، یاس و حرماں نصیبی میں بسر ہو رہی تھی۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو علم کی روشنی سے لوگوں کی زندگی اور آنکھوں میں چمک پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اُن کی زندگی کا نصب العین اور مقصد علم کے ذریعے روشنی پھیلانا تھا۔ سرسیّد اس نظریے کے روح رواں

تھے۔ سرسیّد کے نظریات کے حامیوں اور مخالفین کی ایک بڑی تعداد تھی۔ حالی، سرسیّد کے پیروکار تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی کے شعروسخن کی محفلیں اُجڑ چکی تھیں۔ شعرا دہلی چھوڑ کر دوسرے شہروں میں پناہ گاہ کی تلاش میں تھے۔ ان حالات میں حالی نے شاعری کی طرف رُخ کیا اور غزل سے زیادہ نظم پر توجہ کی۔ حالی کا بنیادی مقصد اصلاح و بیداری پیدا کرنا تھا۔ اُن کا نصب العین اُمّتِ مُسلِمہ کو خوابِ غفلت سے جگانا تھا۔ آباواجداد کے شان دار ماضی کو اُن کے سامنے رکھ کر سنہرے مستقبل کے خوابوں کی تکمیل کرنا تھی۔ اِسی لیے حالی کی ذہنی مناسبت اور ہم آہنگی نظم کے ساتھ قائم ہوئی۔ حالی نے مثنوی، مسدس، ترکیب بند، قطعے کی ہیئت میں نظمیں کہیں۔ وہ پابند نظم کے شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں مختلف حکیمانہ، فلسفیانہ، اخلاقی، حسن فطرت اور مختلف سماجی مسائل وموضوعات کو جگہ دی۔ اُن کی بیشتر نظموں میں خطیبانہ شان کی جھلک پائی جاتی ہے لیکن ''مناجاتِ بیوہ'' اور دوسری نظموں میں داخلی جذبات واحساسات کی ایسی مؤثر تصویر کشی ملتی ہے جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔

حالی کی نظموں کی ایک خاص خوبی اُن کا ارتقائی عمل ہے۔ حالی کسی ایک خیال یا موضوع کو پیش نظر رکھ کر مختلف بندوں میں ربط و تسلسل کے ساتھ اس مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں کہ قاری اس فضا میں جکڑ جاتا ہے۔ نظم آہستہ آہستہ نقطۂ عروج پر پہنچتی ہے اور نظم کا انجام ایک خاص کیفیت واحساس کو بیدار کر کے مقصد کے مکمل اظہار کے بعد مؤثر انداز میں ہوتا ہے۔

حالی کی نظموں کی لفظیات سادہ، عام فہم اور عام بول چال کی ہے۔ غزلوں میں بھلے ہی وہ پیچیدہ تراکیب اور لفظیات کا استعمال کرتے ہیں، لیکن اُن کی غزلوں میں سادگی ہے۔ حالی اپنی نظموں میں ہندی، سنسکرت اور عام بول چال میں مستعمل الفاظ کا استعمال بکثرت کرتے ہیں، جس سے کہ اُن کی نظموں میں خاص تاثیر پیدا ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی نثر میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے لیکن نظموں میں اس سے گریز کیا ہے۔ وہ سادہ عام فہم، عام بول چال میں مستعمل ہندی الفاظ کے استعمال سے اپنی نظموں میں کشش وارتکاز پیدا کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ حالی کی نظمیں دھیمی آہستہ آہستہ لَے میں آگے بڑھتی ہیں اور دھیرے دھیرے ماحول کو قابو میں کر لیتی ہیں اور پوری فضا میں چھا جاتی

ہیں۔ حالی کی نظموں میں ایسی دل پذیری، دردمندی اور اثر انگیزی ہے جس سے کہ قاری اس سحر میں کھوسا جاتا ہے۔ حالی کی موثر زبان اور پر کیف انداز کی ایک منفرد شناخت ہے۔

دراصل حالی کی نظموں کی رسائی اوران کی تفہیم وتعبیر سے قبل حالی کے خلوص کو سمجھنا اور جاننا ضروری ہے۔ حالی کے کردار وعمل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ یہ تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ حالی کا خلوص، دردمندی، غم گساری، قومی وملی احساس وہ عناصر ہیں جواُن کی نظموں میں پگھلے سیسے کی طرح گھُل جاتے ہیں اور ہر تار نفس کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ''مدوجزر اسلام'' موسوم بہ مسدس حالی ایسی ہی طویل نظم ہے جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے کی زندگی، حضور اکرم کی آمد، اسلام کا پیغام وفروغ، قوموں کی زندگی، اُن کی پستی اور عروج وزوال کا نقشہ حالی نے اُن الفاظ میں کھینچا ہے کہ اس عہد کی ساری تصویریں آنکھوں کے سامنے پھرتی نظر آتی ہیں۔ اس نظم میں ایک خاص فکر، خلوص، دردمندی، دل سوزی، اثر پذیری ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا یہ قول بلاشبہ درست ہے:

> ''کیا یہ کہنے اور بتانے کی ضرورت ہے کہ اب تک کتنے ایڈیشن پر ایڈیشن اس کے نکل چکے، کتنی محفلوں میں اس کے بند پڑھے جا چکے۔ وعظ کی کتنی محفلوں کو یہ گرما چکا۔ کتنے ادبی امتحانوں کے نصاب میں داخل ہو چکا کتنے بوڑھوں کی، جوانوں کی، لڑکوں کی زندگی میں انقلاب پیدا کر چکا ہے۔ کتنوں کو رُلا کر یہ رہا... اصل سوال یہ ہے کہ اس آن کا اور اس شان کا۔ اس جمال کا اور اس کمال کا اردو میں کوئی اور مسدس ہے بھی۔''

(بحوالہ شجاعت علی سندیلوی، حالی بحیثیت شاعر، ۱۹۶۰، ص ۲۶۳)

اس طویل نظم میں پرزور استدلال اور بلند آہنگی ہے، جس میں انسانیت کی زبوں حالی کی مجسم تصویر اور اُس پیکر کو پیش کیا گیا ہے جس کا رشتہ ہمارے اسلاف اور آباواجداد سے ہے۔ اس وراثت کی جیتی جاگتی تصویر یہ مسدس ''مدوجزر اسلام'' ہے۔ دو بند ملاحظہ ہوں:

کوئی قرطبہ کے کھنڈر جا کے دیکھے
مساجد کے محراب و در جا کے دیکھے
حجازی امیروں کے گھر جا کے دیکھے
خلافت کو زیر و زبر جا کے دیکھے

جلال اُن کا کھنڈروں میں ہے یوں چمکتا
کہ ہو خاک میں جیسے کندن دمکتا

وہ بلدہ کہ فخر بلاد جہاں تھا
تر و خشک پر جس کا سکّہ رواں تھا
گڑا جس میں عبّاسیوں کا نشاں تھا
عراقِ عرب جس سے رشک جناں تھا

اُڑا لے گئی باد پندار جس کو
بہا لے گئی سیل تاتار جس کو

حالی نے اس طویل نظم میں اُمت مسلمہ کی ذلت اور زبوں حالی کے اسباب بھی بتائے ہیں بالخصوص اُن نام نہاد علما، مذہب کے عیار و مکار انسان اور پیشہ ور مذہبی ٹھیکہ داروں کی بھی خوب خوب سرزنش کی ہے۔ یہ بند ملاحظہ ہوں:

نہیں مانگنے کا طریق ایک ہی یاں
گدائی کی ہیں صورتیں نت نئی یاں
نہیں حصر کنگلوں پہ گدیہ گری یاں
کوئی دے تو منگتوں کی ہے کیا کمی یاں

بہت ہاتھ پھیلا کے زیر ردا ہیں
چھپے اُجلے کپڑے میں اکثر گدا ہیں

بہت آپ کو کہہ کے مسجد کے بانی
بہت بن کے خود سیّد خاندانی

بہت سیکھ کر نوحہ و سوز خوانی
بہت مدح میں کرکے رنگیں بیانی

بہت آستانوں کے خدام بن کر
پڑے مانگتے کھاتے پھرتے ہیں در در

مشقت کو محنت کو جو عار سمجھیں
ہنر اور پیشے کو جو خوار سمجھیں
تجارت کو کھیتی کو دشوار سمجھیں
فرنگی کے پیشے کو مُردار سمجھیں

تن آسانیاں چاہیں اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی جو کل نہ ڈوبی

بڑھے جس سے نفرت وہ تقریر کرنی
جگر جس سے شق ہوں وہ تحریر کرنی
گنہگار بندوں کی تحقیر کرنی
مسلمانوں بھائیوں کی تکفیر کرنی

یہ ہے عالموں کا ہمارے طریقہ
یہ ہے ہادیوں کا ہمارے سلیقہ

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے بعد لکھی گئی یہ نظم (۱۸۷۹ء) سرسیّد کی خصوصی فرمائش پر حالی نے لکھی تھی جس کے بارے میں سرسیّد لکھتے ہیں:

''بے شک میں اس کا محرک ہوا ہوں اور اس کو میں اپنے اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا تو دنیا سے کیا لایا؟ میں کہوں گا میں حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

(بحوالہ جدید نظم حالی سے میراجی تک، کوثر مظہری، ص ۵۶)

بلاشبہ ''مدوجزر اسلام'' حالی کا لازوال کارنامہ ہے جس میں حالی نے مسلمانوں کے

شان دار ماضی کی تصویر کشی کی ہے اور اُن کی غیرت وحمیت کو للکارا ہے۔ ان کی کوتاہیوں، کمیوں پر سے پردہ اُٹھایا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حالی نے اس نظم کے علاوہ اگر کچھ بھی نہیں لکھا ہوتا تو بھی اردو نظم نگاری کی تاریخ میں انھیں اس عظیم تخلیقی شاہکار کی وجہ سے ہمیشہ یاد کیا جاتا۔

حالی نے اپنی نظموں میں جہاں مختلف ہیئتوں کا استعمال کیا ہے، وہیں انھوں نے مختلف موضوعات ومسائل کو اپنی نظموں میں جگہ دی ہے۔ اُن کی بعض نظمیں تنقید کے در وا کرتی ہیں۔ مثلاً شعر کی طرف خطاب، مشاعرے کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر اور نکتہ چینی وغیرہ۔ حالی کی یہ نظمیں تنقیدی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اے شعر دل فریب نہ ہو تو تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام
ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو

(نظم شعر کی طرف خطاب)

اس پوری نظم میں حالی نے اپنے نظریۂ شعر کی وضاحت کی ہے، جس میں سادگی، راستی، دل گدازی پر زور دیتے ہیں اور اپنا راستہ الگ بنانے پر اصرار کرتے ہیں۔ عام روش سے ہٹ کر، بے نیاز ہو کر فریفتگی اور دل فریبی کا دامن چھوڑ کر، سچائی سے دلوں میں گھر کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ حالی کے خیالات سے بلاشبہ اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ابتدا سے ہی حالی کا شاعری کے حوالے سے جو نظریہ تھا، جو اُن کی اپنی فکر تھی اس کی وضاحت بھی ہوتی ہے۔ تصنع، تکلف، مبالغہ سے دُور ہٹ کر حقیقت وصداقت کی دنیا میں وہ سانسیں لینے کے خواہاں تھے۔ یہ الگ سوال ہے کہ شاعری میں اس کی کہاں تک گنجائش ہے؟

حالی کی بعض نظمیں سیاسی نوعیت کی ہیں۔ حالی کا عہد سماجی، سیاسی، مذہبی انتشار واصلاح کا تھا۔ وہ اپنے عہد کے نبض شناس تھے۔ حالی کے سیاسی شعور پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حالات وزمانے کی رفتار پر اُن کی نظر تھی۔ ابتدا میں سرسیّد سے دوری کے بعد حالی سرسیّد کے قریب ترین رفقا میں شامل ہو گئے۔ لیکن حالی اپنی نظموں میں انگریزوں پر بے حد

شائستگی سے حملے بھی کرتے ہیں اُن کی ایک مشہور نظم ''کالے اور گورے کی صحبت کا امتحان'' اس مثال کے لیے کافی ہے۔

حالی کی اہم شناخت اُن کی اخلاقی، معاشرتی واصلاحی نظمیں ہیں۔ جن کی فہرست کافی طویل ہے پھر بھی اُن میں سے چند نظموں کا ذکر ناگزیر ہے۔ مناجات بیوہ، چپ کی داد، برکت اتفاق، بیٹیوں کی نسبت، کلمۃ الحق، جواں مردی کا کام وغیرہ۔ نظم 'مناجات بیوہ' (۱۸۸۴ء)، کی پوری فضا غم واندوہ میں ڈوبی اور بیوہ کے دکھوں، تکلیفوں، پریشانیوں میں لپٹی ہوئی ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ حالی نے ایک بیوہ کے داخلی جذبات واحساسات کی اس قدر پراثر تصویر کشی کس طرح کی۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اس نظم کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''حالی نے عمر بھر بجز ایک ''بیوہ کی مناجات'' کے اگر ایک شعر بھی نہ کہا ہوتا تو اُن کے لیے یہی ایک نظم دنیا و عقبیٰ میں بس تھی۔ باتیں اتنی سچی اور روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی کہ آسمان کے فرشتے بھی وجد میں آ آ کر رہیں۔ بول اتنے میٹھے کہ خود معصومیت بے اختیار لپٹ لپٹ کر بلائیں لینے لگے۔''
>
> (بحوالہ جدید نظم حالی سے میراجی تک، کوثر مظہری، ص ۷۵)

پوری نظم میں ایک خاص کیفیت، اداسی، محرومی، محزونی، درد واندوہ میں ڈوبی ہوئی بپتا ہے اُسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ حالی بیوہ کے درد، ذہنی انتشار، نفسیاتی کیفیت کو نظم کے قالب میں ڈھالنے میں کس طرح کامیاب ہوئے ہیں۔

نظم ''مناجاتِ بیوہ'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ایک کو تو نے شاد کیا ہے — ایک کے دِل کو داغ دیا ہے
ہر دم تیری آن نئی ہے — جب دیکھو تب شان نئی ہے
یاں پچھوا ہے، واں پُروا ہے — گھر گھر تیرا حکم نیا ہے
پھول کہیں مُرجھائے ہوئے ہیں — اور کہیں پھل آئے ہوئے ہیں
ایک کو مرنے تک نہیں دیتے — ایک اُکتا گیا لیتے لیتے
آس ہی کا یاں نام ہے دُنیا — جب نہ رہی یہ ہی تو رہا کیا

دن بھیانک اور رات ڈرانی　　یوں گزری ساری یہ جوانی
وہ چیت اور پھاگن کی ہوائیں　　وہ ساون بھادوں کی گھٹائیں
وہ گرمی کی چاندنی راتیں　　وہ ارمان بھری برساتیں
کس سے کہوں کس طور سے کاٹیں　　خیر، کٹیں جس طور سے کاٹیں
دن میں جوانی کے کٹے ایسے　　باغ میں پنچھی قید ہو جیسے
پہروں سوچتی ہوں یہ جی میں　　آئی تھی کیوں اس نگری میں؟
عورت ذات کا تنہا جینا　　ہردم خونِ جگر کا پینا
قوم کی ریتیں دیس کی رسمیں　　کیا ہے وہ جو تیرے نہیں بس میں
گھونٹ اک ایسا مجھ کو پلا دے　　تیرے سوا جو سب کو بھلا دے

نظم قدرے طویل ہے جو آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے۔ سماجی بندشوں اور حد بندیوں پر لطیف چوٹ بھی ہے۔ اپنی پریشانیوں، الجھنوں کا بیان ہے۔ پوری زندگی اجیرن بن چکی ہے اور کوئی حال دل پوچھنے والا نہیں، اس کا اظہار ہے۔ اللہ سے شکوہ ہے، شکایت ہے اور آخر میں اُسی کی بارگاہ میں پناہ حاصل کرنے اور پوری زندگی اطاعت خداوندی میں گزار دینے کی خواہش و دعا ہے۔ دراصل یہی آخری حصہ حالی کے مزاج و کردار اور اُن کے اصلاحی جذبے کا مظہر ہے۔ عورتوں کی بے بسی اور بے کسی پر حالی نے اپنی دوسری نظموں میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ ''چپ کی داد'' (۱۹۰۵ء) حالی کی ایسی ہی نظم ہے جس میں وہ عورتوں کی عظمت کے گیت گاتے ہیں۔ اُن کے مذہبی و سماجی مرتبے کا بیان کرتے ہیں لیکن زمانے کے ہاتھوں عورتوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے جا رہے ہیں وہ جس طرح بے بسی، بے کسی، مظلومیت کا استعارہ بن کر رہ چکی ہیں اس پر بھی اظہار افسوس کرتے ہیں۔ آخری حصے میں تحریک تعلیم نسواں کی آمد پر خوشی کا اظہار بھی ہے۔ والیۂ ریاست بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم اس تحریک کی سرپرست تھیں۔ اس تحریک کی راہ میں بڑے روڑے اٹکائے گئے لیکن خان بہادر شیخ عبداللہ اور ان کے رفقا کی کوششوں سے علی گڑھ میں ایک گرلز ہائی اسکول قائم ہو گیا۔ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہا اور علی گڑھ سے ''۱۹۰۵ء'' میں اس

تحریک کی اشاعت کی غرض سے رسالہ ''خاتون'' جاری کیا گیا اور نواب سلطان جہاں بیگم کی مالی امداد سے مسلمان طالبات کے لیے ۱۹۰۶ء میں ایک بورڈنگ ہاؤس بھی قائم کیا گیا۔ اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ حالی کا تعلق بلاواسطہ اور بالواسطہ اصلاحی تحریکوں سے رہا ہے اور اُن کے خون میں مظلوموں، عورتوں، کمزوروں، معصوموں کی اصلاح و بہتری کا جذبہ گردش کرتا رہا ہے۔ حالی اسلام مذہب کے سچے حمایتی اور پیروکار تھے اور ان کا کوئی بھی قدم خلاف مذہب اُٹھتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس عمل میں حالی اپنی نظموں میں چھوٹے چھوٹے اور بظاہر معمولی واقعات کو بیان کر کے اخلاقیات کا درس دیتے ہیں۔ اس طرح کی نظموں کی تعداد بھی کافی ہے۔ ان میں سے ایک نظم ''جواں مردی کا کام'' بھی ہے۔ حالی کی بعض نظموں میں طنزیہ و مزاحیہ انداز بھی ملتا ہے لیکن ان نظموں میں بھی اخلاقیات کا پہلو نمایاں ہے۔ تفاخر سے نفرت، نوکروں پر سخت گیری کرنے کا انجام، خودستائی، سیّد احمد خاں کی تکفیر، سیّد احمد خاں کی مخالفت کی وجہ، ایسی ہی نظمیں ہیں۔ حالی کی بعض نظمیں مناظراتی بھی ہیں۔ غرض یہ کہ حالی کی شاعری کا ایک بڑا حصہ درسی، اخلاقی، معاشرتی، اصلاحی ہے لیکن حالی کی نیچرل شاعری اور قومی شاعری انھیں دیگر شعرا سے ممتاز و ممیّز کرتی ہیں۔ ''برکھارت'' (۱۸۷۴ء) حالی کی ایسی ہی مناظر فطرت سے بھرپور نظم ہے، جس میں گرمی کی تپش، قدرت کے عجائبات، شاخ و درخت کی جوانی، موروملخ کی زندگانی، سارے برس کی جان برسات کا ذکر ہے۔ اس نظم میں دھوپ گرمی، ریگِ صحرا، آندھی، لُو، زمین سے نکلتے شعلوں، بادِ سموم کا ذکر انتہائی پراثر انداز میں کیا گیا ہے۔ بازار سنسان پڑے تھے اور انسان کی شکل باہر سڑکوں، گلیوں میں نظر نہ آتی تھی مگر جب برسات کا ڈنکا بجا تو گرمی ختم ہوگئی۔ گھنگھور گھٹائیں چھا گئیں اور جنت کی ہوائیں آنے لگیں۔ باغ، کھیت، شجر سبھی ہرے بھرے ہوگئے۔ کہسار پھولوں سے پٹ گئے اور جنگل میں چرند و پرند کی آوازیں گونجنے لگیں۔ جنگل، شہر، گاؤں ہر طرف خوشی کی لہریں دوڑ جاتی ہیں۔ پوری نظم میں مناظر فطرت کی زبردست تصویر کشی کی گئی ہے۔ جزئیات نگاری کا بھی اعلیٰ نمونہ موجود ہے۔ نظم پڑھ کر گرمی اور پھر برسات کا موسم آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ مگر حالی نے آخر میں اپنی غریب

الوطنی کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ پردیس میں جب کہ دیس کی یاد پڑی ہو، دِل شاد نہیں ہوسکتا کوئی بھی خوش گوار ہَوا کا جھونکا اور بارشوں کی پھوار اس کے دل و دماغ میں خوش گوار احساسات نہیں جگا سکتے۔ دراصل یہ نظم حالی کے قیام لاہور کے درمیان لکھی گئی تھی اور انجمن پنجاب کے مشاعرے میں پیش کی گئی تھی۔

''حب وطن'' (۱۸۷۴ء) بھی حالی کی قومی وملی جذبے سے سرشار ایک خوب صورت نظم ہے، جس میں وطن عزیز سے شدید محبت کا جذبہ ملتا ہے۔ اس نظم کے مشہور اور ضرب المثل دو شعر ملاحظہ ہوں:

تیری اک مشت ِ خاک کے بدلے
لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

پوری نظم میں وطن سے محبت کی لَے آہستہ آہستہ تیز ہوتی ہے اور آخر میں حالی اپنے ہم وطنوں کو مخاطب کرتے ہیں کہ انھیں ملک وقوم کی خدمت کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ کسی ہم وطن سے غیریت، کدورت نہیں رکھو:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

حالی کی نظموں کا مجموعی طور پر جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالی نے شاعری سے زیادہ اپنے اصلاحی مقاصد پر توجہ دی اور اُن کا مقصد قوم میں بیداری کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ وہ قوم، ملک وملت کی تعمیر میں اپنی شاعری سے کام لینا چاہتے تھے۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ نثر سے زیادہ شاعری لوگوں کے دلوں میں فوری اثر کرتی ہے اسی لیے وہ جب بھی کسی پبلک میٹنگ کو خطاب کرتے، کانفرنس میں تقریریں کرتے تو اپنی نظم کا کوئی ٹکڑا ضرور پڑھتے۔ حالی کی نظمیں اُس عہد میں لوگوں کی زبان پر تھیں اور عام

عوام اس سے فوری طور پر متاثر ہوئے۔ حالی کو نظم نگاری میں بے پناہ قدرت حاصل ہے اُن کی نظمیں ایک مکمل اکائی کی شکل میں نظر آتی ہیں، جو نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ وہ اپنے مرکزی موضوع پر نگاہیں جمائے رہتے ہیں۔ ان کی نظموں کا ارتقا فطری نظر آتا ہے، جس میں بنیادی موضوع کے علاوہ دوسری تفصیلات بھی آجاتی ہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اُن کی شہرۂ آفاق نظم مسدس ''مدوجزر اسلام'' پر کافی اعتراضات بھی ہوئے اور اس میں فنّی نقائص کی بابت کئی ناقدوں نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا۔ کلیم الدین احمد کا خیال ملاحظہ ہو:

> ''قصداً لکھی گئی، اس لیے اس میں ہر جگہ آورد ہے اور آورد کو آمد میں تبدیل نہیں کیا گیا، خیالات ہیں اور بلند قسم کے بھی ہیں لیکن ان کو احساسات کے سانچے میں نہیں ڈھالا گیا۔ اس لیے شعریت کا پتہ نہیں... مسدس حالی ایک ریگستان ہے جس میں کبھی کبھی کوئی مختصر سی سرسبز و شاداب جگہ ملتی ہے جس سے لمحہ بھر کے لیے دماغی سکون و فرحت کا سامان ہو جاتا ہے، لیکن زیادہ تر تو پریشانی ہی پریشانی ہے۔''
>
> (اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۳۰-۲۹)

کلیم الدین احمد کے اس دعوے کی تکذیب مسدس حالی کی بے پناہ مقبولیت اور تاثر ہے۔ نظم کا جو ہیولیٰ حالی تیار کرتے ہیں اس میں ابتدا تا انتہا ایک ربط ہوتا ہے۔ یہ درست کہ کہیں کہیں کوئی ٹکڑا بے کیفی کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ اکثر حالی کی فکر اور ان کا نیک جذبہ غالب آجاتا ہے اور وہ فنی خصوصیات، اسلوب، رموز و علامات پر توجہ صرف نہیں کرتے۔ مگر میرے اس بیان کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ حالی کی بیشتر نظموں میں یہ خامیاں موجود ہیں۔ اُن کی نظمیں فن کے اعلیٰ معیار پر مکمل اُترتی ہیں اور وہ اردو شاعری کا بہترین نمونہ ہیں، جن میں حالی نے مختلف موضوعات و مسائل پر اپنے سماجی و سیاسی شعور کے مدنظر کھل کر لکھا ہے۔

یہ درست ہے کہ حالی کی شاعری میں شور و غوغا نہیں، ہنگامہ برپا کرنے کی صورت

نہیں، ایک مدھم لے ہے، تیز روشنی نہیں، لیکن یہ مدھم لے جب آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں سورج کے طلوع ہونے کی طرح روشن ہوتی ہے تو دل و دماغ کو منور کر دیتی ہے۔

حالی نے اُن موضوعات پر قلم اٹھایا جن پر اُن سے پہلے کسی دوسرے شاعر نے اس توجہ و تندہی سے خامہ فرسائی نہیں کی تھی، اس کے لیے حالی نے نظم کی مختلف ہیئتوں مسدس، قطعہ، ترکیب بند کا استعمال کیا، اُن الفاظ، محاورات، تشبیہات، استعارات، اقوال، کہاوتوں سے بھی اپنی نظموں میں کام لیا ہے جو روزمرہ میں عام عوام میں مستعمل رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ نظمیں لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئیں۔ حالی نے فصاحت اور تناسب الفاظ سے زیادہ موضوع، مواد، زبان اور بیان پر توجہ دی اور اپنے اصلاحی و افادی پہلو کو پیش نظر رکھا۔ حالی کی نظموں کے بارے میں ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں:

> ''ادبی اعتبار سے ان نظموں کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ انھوں نے شاعری کی غیر ضروری حد بندیاں توڑیں، اور اُسے ہر قسم کے افکار و مسائل، جذبات و احساسات کی آماجگاہ بنایا۔ اب شاعری عشق کی سرگوشی نہیں تھی، علم و ادراک کے سارے گوشوں کی آواز تھی اور اسی آواز کو سوز و گداز، جذبے کے خلوص اور شخصیت کی آگ میں تپا کر جمالیاتی رنگ و روغن بخشا گیا تھا۔ انداز بیان کے اعتبار سے نیچرل شاعری کے تقاضوں کے پیش نظر حالی نے شاعری کا حسن تشبیہ و استعارے، تلمیح یا خیال بندی کے جوہر کے بغیر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ان کا فن بیرونی آراستگی اور آرائش در و بام کا فن نہیں بلکہ اندرونی تب و تاب کا فن ہے جو خیال کے جمال اور فکر کی آنچ سے پیدا ہوتا ہے وہ صیقل کے قائل نہیں بلکہ ایسے سادہ حسن کے قائل ہیں جو غازہ اور زیور سے کم و بیش بے نیاز ہو۔''

(بحوالہ، حالی بحیثیت شاعر: شجاعت علی سندیلوی، ص ۳۶۱)

حالی کے یہاں خیال کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ حالی کے بے پناہ خلوص نے اُن کی نظموں میں وہ شدت پیدا کر دی کہ وہ اُس عہد کے لیے اور آئندہ نسلوں

کے لیے مشعل راہ بنیں۔ حالی کا عہد تغیر وتبدل، مذہبی ومعاشرتی تحریکات کا تھا۔ اُن کے عہد کے بیشتر شعرا جب اردو غزل کے گیسو وکاکل سنوار رہے تھے حالی نے اس سے اجتناب کیا اور اُس صنف شاعری پر یعنی نظم پر توجہ دی جس کی اُس زمانے کو شدت سے ضرورت تھی۔ حالی کی نظموں کی سادگی، سلاست، جامعیت اور صداقت نے لوگوں کو اُن نظموں کا گرویدہ بنادیا۔ حالی کے حکیمانہ مزاج اور درویشانہ طبیعت نے نظموں میں خلوص وصداقت کے وہ جلوے بکھیرے کہ اُن کی نظموں کی شدت میں اُس زمانے سے لے کر اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ اُن کی اصلاح پسند طبیعت، عقل پسندی اور حقیقت نگاری نے سبھوں کو ان کا قائل کردیا بقول خورشید الاسلام ''حالی نے اردو ادب کو نظم کی شکل میں ایک نئی صنف سخن دی، اور بقول علی سردار جعفری:

> ''حالی جدید ادبی تحریک کے بانی ہونے کے باوجود سیاسی رجعت پسندی کے شکار تھے اور رجعت پسندی کا شکار ہوتے ہوئے بھی سماجی اور ادبی طور پر بعض ترقی پسند پہلوؤں کے ترجمان تھے جو عقل پسندی (عقلیت) کی شکل میں نمایاں ہوئے... لیکن اس سارے تضاد کے باوجود جو چیز اردو ادب کے دھارے کا رُخ موڑنے کا سبب بنی۔ وہ اُن کی عقل پسندی اور حقیقت نگاری کی کوشش تھی۔''

(ترقی پسند ادب، علی سردار جعفری، ص ۱۰۱)

بلاشبہ حالی اردو نظم نگاری کی تاریخ میں ایک سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں اور وہ اپنی اجتہادی کوششوں وکاوشوں کی وجہ سے نئی تاریخ رقم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

حالی کے شخصی مراثی

اردو شاعری میں حالی ایک شخصی مرثیہ نگاری کی حیثیت سے بھی بلند مقام رکھتے ہیں۔ حالی سے قبل مومن وغالب اور چند دوسرے شعرا نے بھی شخصی مراثی لکھے۔ حالی کے مرثیوں کی کل تعداد پانچ ہے:

(۱) مرثیۂ غالب (۱۸۶۹ء)

(۲) بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا مرثیہ (۱۸۸۶ء-۱۸۸۵ء)

(۳) مرثیہ حکیم محمود خاں (۱۸۹۲ء)

(۴) ملکۂ وکٹوریہ کا مرثیہ (۱۹۰۱ء)

(۵) نواب محسن الملک کا مرثیہ (۱۹۰۷ء)

یہ پانچوں مرثیے اردو کی مرثیہ نگاری کی تاریخ میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

''مرثیۂ غالب'' ترکیب بند میں ہے اور اردو کے ان چند شاہکار مرثیوں میں سے ایک ہے، جس کے مطالعے کے بعد بے ساختہ حالی کو داد دینے کا جی چاہتا ہے۔ غالب سے ان کا قلبی رشتہ تھا اور غالب کو وہ اپنا استاد تسلیم کرتے تھے۔ یہ تو ایک ذاتی نوعیت کی بات تھی لیکن بحیثیت شاعر و ادیب غالب کا جو مرتبہ ان کے ذہن و دل میں تھا اور غالب کے شخصی اوصاف سے جس قدر حالی متاثر تھے، اس کا اظہار وہ مرثیہ غالب میں کرتے ہیں۔ غالب کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا اور انھوں نے اسی سال یہ مرثیہ تحریر کیا۔ غالب کے انتقال کے بعد رنگِ عالمِ فانی کو دیکھ کر ان کا دل عیشِ دنیا سے سرد ہو گیا۔ اپنی اسی کیفیت کا اظہار وہ اپنے اس مرثیہ میں کرتے ہیں۔ غالب کو وہ بلبلِ ہند، نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس، پاک دل، پاک ذات، پاک صفات، بذلہ سنج، شوخ مزاج تسلیم کرتے ہیں اور پھر ان کے ذاتی اوصاف پر سے کچھ اس طرح پردہ اٹھاتے ہیں کہ غالب کی شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

لاکھ مضموں اور اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلّف اور اس کی سیدھی بات

تھیں تو دلّی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا — شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

پورے مرثیے میں جو خلوص عقیدت پوشیدہ ہے اور جو تاثیر پنہاں ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی۔ اس مرثیے میں دس بند ہیں۔ ابتدائی دو بندوں میں حالی دنیا کی بے ثباتی اور دنیا کو ایک دھوکہ، تماشہ، سراب، بیگانہ تسلیم کرتے ہیں اور اس کے بعد وہ

غالب کے مختلف اوصاف، علمی کمالات، علم و فضل، سخن وری، نکتہ دانی کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں کہ استاد کی موت پر شاگرد کا اس طرح سے بے چین ہو جانے پر رشک آنے لگتا ہے۔ غالب کی ایک ایک خوبیوں کا ذکر وہ آہستہ آہستہ تفصیل سے کرتے ہیں۔ ان کے خلوص، اخلاق، انسانیت، احباب نوازی کا بیان نہایت ہی خوب صورت ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔ چند ذاتی نوعیت کی باتیں بھی اس مرثیے میں در آئی ہیں۔ مثلاً تین شعر ملاحظہ ہوں:

اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے — جا کے دلّی سے آئے گا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں ناتمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

حالی کی نظر میں غالب بلاشبہ نقدِ معانی کے گنج داں تھے۔ رشکِ شیراز و اصفہان تھے۔ سرمایہ دارِ سخن تھے۔ لیکن حقیقت یہ بھی ہے کہ حالی کا یہ ذاتی ناقابلِ تلافی نقصان تھا، جس کا ماتم وہ کرتے ہیں اور اس ناگہانی موت پر آہ و بکا بھی کرتے ہیں۔ اردو مرثیہ کی تاریخ میں اس مرثیے کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ معاملہ زبان و بیان کا ہو یا ہیئت و مواد کا، تشبیہات و استعارات کا ہو یا پھر تراکیب و ضرب الامثال کا، حالی کا یہ مرثیہ ایک اعلیٰ مثال ہے جسے حالی نے خونِ جگر سے رقم کیا ہے۔ اس کی ہیئت اور اسلوب بھی اپنی خاص شناخت قائم کرتی ہے اور اردو مرثیے میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔

حالی نے دوسرا مرثیہ اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کی وفات کے بعد ۸۶-۱۸۸۵ء میں رقم کیا۔ حالی کی پرورش و پرداخت میں ان کے بڑے بھائی خواجہ امداد حسین کا بڑا اہم رول تھا۔ بڑے بھائی کے اچانک انتقال کے بعد حالی کی طبیعت میں ایک خاموشی چھا گئی اور طبیعت کی روانی ختم ہوگئی۔ اس مرثیے کا ہر شعر ذاتی و قلبی رشتے و درد کی کہانی بیان کرتا ہے۔ چونکہ بڑے بھائی نے انھیں بیٹے کی طرح پالا تھا اور جب اچانک ان کا انتقال ہو جاتا ہے تو حالی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں اور بھائی کی ناگہانی موت پر ماتم کرتے ہیں۔ مرثیہ کا آغاز خود کلامی سے ہوتا ہے اور سوال و جواب کی صورت میں مؤثر

ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں۔اس مرثیے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا — سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باغ کی پانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو! — کیا ڈھونڈتے ہو اس کی طبیعت میں روانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت — مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر — ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

اس مرثیے میں بھی ایک خاص درد واثر ہے اور انسانی رشتے اور برادرانہ محبت واخوت کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔ اس مرثیہ کا موازنہ مرثیۂ غالب سے کیا جانا درست نہیں۔ غالب ایک عظیم شاعر، فلسفی اور ہندوستانی ادب کے درخشندہ ستارہ تھے، ان کی شخصیت بے حد رچی ہوئی اور دل نواز تھی۔ ان کا غم ہندوستانی عوام کا غم تھا۔ اس لیے غالب کے مرثیے کی شدت اور کیفیت میں سبھی ڈوب جاتے ہیں۔ جناب خواجہ امداد حسین کی موت کا صدمہ حالی کا ذاتی صدمہ تھا۔ اسی لیے اس مرثیہ کی اثر انگیزی میں عام طور پر کمی پائے جانے کا احساس ہوتا ہے۔ ان دونوں مرثیوں سے مختلف حالی کا تیسرا مرثیہ حکیم محمود خاں کا مرثیہ ہے، جسے حالی نے ۱۸۹۲ء میں مسدس کی ہیئت میں لکھا، جس میں چھیاسی بند ہیں۔ اس مرثیہ میں ملّت اسلامیہ کی زبوں حالی، پستی کی تصویر کشی حالی نے موثر انداز میں کیا ہے۔ ابتدائی دس بند میں حالی دلّی کے ماضی کے اوراق اور اس کی عظمت کی تصویر کو کھرچ کر عیاں کرتے ہیں۔ اس کے بعد حکیم محمود خاں دہلوی کے اوصاف کا بیان ہے اور ان کی علمیت، احباب نوازی، انسان دوستی، بے خوفی، قوم وملت پر مر مٹنے کا جذبہ، علمی فضل وکمال کا ذکر ملتا ہے۔ حالی کا چوتھا مرثیہ ملکہ وکٹوریہ کا مرثیہ ہے جو ۱۹۰۱ء میں لکھا گیا اور چھ بندوں پر مشتمل ہے جو ترکیب بند میں ہے۔ حالی کا پانچواں اور آخری مرثیہ نواب محسن الملک کے انتقال پر ۱۹۰۷ء میں قطعہ یا ایک بند کی شکل میں لکھا گیا جس میں نواب محسن الملک کی مختلف خوبیوں کا ذکر ہے۔ انھیں حالی نے ملک کا محسن، مسلمانوں کا غم خوار، سرسید کا بدل، قوم کا فدائی قرار دیا ہے۔ جس کے مرنے کے بعد ساری قوم عزادار ہے اور کشمیر سے راجکماری تک ایک کہرام ہے۔ اس مرثیہ میں کل

نوشعر ہیں۔ لیکن حالی نے محسن الملک کے اوصاف اور خوبیوں کے بیان میں جس جامعیت اور بلیغ انداز بیان کا اظہار کیا ہے، وہ بے مثال ہے۔

حالی کی خوبی یہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں ایک خاص دل سوزی، دردمندی اور خلوص ملتا ہے۔ حالی صاف وشفاف، عام فہم، سادہ اور سلجھے ہوئے انداز سے مرثیہ کو پیش کرتے ہیں اوران کا بیان لوگوں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ حالی نے مرثیے کے لیے بھی مسدس، قطعہ، ترکیب بند کی ہیئت کو اپنایا اور مرثیے کی صنف کے لیے کسی خاص ہیئت کو لازمی قرار نہیں دیا۔ یہ بات بھی سچ ہے کہ صنفِ مرثیہ کے ذکر کے ساتھ ہی جو خیال واقعاتِ کربلا کی طرف مڑ جاتا تھا، حالی نے اسے ایک نیا رخ دیا اور شخصی مرثیوں پر شعرا کی توجہ ہوئی۔

حالی کی رباعیاں

مقدمہ شعروشاعری میں حالی لکھتے ہیں:

''بعض خیالات جو دو مصرعوں میں بالکل یا زیادہ خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتے ان کو قطعہ یا رباعی کے لباس میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔''

خواجہ الطاف حسین حالی نے جذبے کے اظہار کے لیے صنفِ رباعی کو بڑی اہمیت دی ہے۔ غزل کی ریزہ خیالی اور انتشار وابہام کے مقابلے میں ان کی ذہنی ہم آہنگی، صنف رباعی اور نظم سے زیادہ تھی۔ دراصل حالی شاعری سے اصلاحی کام لینے کے قائل تھے۔ مقصدیت کا ہمیشہ ان پر غلبہ رہا۔ ان کی رباعیوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موضوع ومواد کے اعتبار سے ان کی رباعیاں اخلاقیات، مذہبیات، اصلاح قوم وملت، تعلیم وتربیت جیسے موضوعات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی جو سیاسی وسماجی صورت حالی تھی اس پس منظر میں حالی کی رباعیوں کو جانچنا اور پرکھنا ضروری ہے۔ قوم کی پستی، زبوں حالی، انتشار، تہذیب وتمدن کا بگھراؤ، قدیم روایتوں سے دامن کشی، مغربی تہذیب کی یلغار، مایوسی، افسردگی، سستی، کاہلی، عیاشی، مذہب سے بیگانگی کو دیکھ کر حالی کا فکرمند ہونا لازمی تھا۔ انھوں نے قوم کے اندر سے مایوسی ختم کرنے کا عزم کیا۔

حالی نے اپنی رباعیوں میں اسلاف کے کارناموں، ان کی حوصلہ مندی اور عظیم تاریخ کا بیان کیا اور قوم وملت میں اصلاح کرنے، اخلاقی درس دینے کی بھرپور کوشش کی۔ حالی کی چند رباعیاں ملاحظہ ہوں:

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

جو کرتے ہیں کچھ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع، دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسن گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

دنیائے دنی کو نقش فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں

موسیٰ کو نہ ملی قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہر انسان کی کسوٹی سونا

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شاہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت تو خدائی ہے یہ

پہلی رباعی میں حالی یہ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نیکی اور بدی پاس پاس ہیں۔ اپنی نیکیوں پر غور کرنے کی ضرورت بالکل نہیں ہے کیونکہ اگر خلوص ختم ہو جائے تو نیکی خود بدی بن جاتی ہے۔ اسی طرح دوسری رباعی میں حالی گفتار و کردار میں افتراق کو ظاہر کرتے ہیں کہ قول و فعل عام طور پر کس قدر تضاد پایا جاتا ہے۔

حسن گفتاری کے ساتھ ساتھ کردار کا اعلیٰ ہونا لازمی ہے ورنہ عام طور پر دیکھا یہ جاتا ہے کہ جس قدر گفتار کا حسن بڑھتا جاتا ہے اسی قدر کردار میں کمی آتی جاتی ہے۔

حالی دوسری رباعیوں میں بھی اخلاقیات کا درس دیتے ہیں کہ جس کو زندگی کا بھروسہ نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ اس لیے ہر کام کا آغاز ایک عزم کے ساتھ کرنا چاہیے اور یہ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے کہ ہر سانس ایک عمر جاودانی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ حالی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے والوں پر بھی گہرا طنز کرتے ہیں۔ محنت کی اہمیت تاریخی پس منظر میں عیاں کرتے ہیں۔ دولت حاصل ہو جانے پر ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے

ہیں اور ضروریات کو محدود کرنے پر زور دیتے ہیں۔

حالی کی رباعیوں نے عام عوام کو غور و فکر کی دعوت دی۔ حالی ایک مصلح تھے۔ وہ قوم وملت کے غم خوار تھے اور سماج میں پھیلی ہر طرح کی برائیوں پر ان کی نظر تھی اور ان برائیوں کو وہ جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انھوں نے اپنی شاعری سے بھی کام لیا۔

حالی کا یہ بھی خیال تھا کہ مذہب سے بیگانگی اور خدا کے وجود اور اس کے احکام سے بے خبری و بے اعتنائی نے قوم کو ذلت دی۔ مذہب جو رواداری، اخوت، بھائی چارگی، مساوات کا درس سکھاتا ہے اور سبھی مذاہب میں خدا کے وجود اور وحدانیت کا ذکر ملتا ہے۔ انسان جب بھی کسی مصیبت و پریشانی میں گرفتار ہوتا ہے تو اسے خدا کی یاد آتی ہے تو پھر اس سے اتنی دوری اور اس کے احکام پر عمل کرنے سے بے رغبتی کیوں پائی جاتی ہے۔ حالی کی درج ذیل رباعیاں ملاحظہ ہوں:

طوفاں میں ہے جب جہاز چکر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا
ہستی سے ہے رنگ تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

ان رباعیوں میں خدا کی وحدانیت پر کامل یقین رکھنے پر زور ملتا ہے۔ خدائے بزرگ برتر ہی لائق اطاعت ہے۔ اُس کے علاوہ سارے سہارے کمزور ہیں اور اُس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ سبھوں نے خدا کی ذات اور وجود کا اقرار کیا ہے۔

حالی کی رباعیاں ان کی اپنی ذات وصفات کا آئینہ ہیں۔ وہ شاعری سے محض تفریح طبع کا سامان فراہم نہیں کرتے بلکہ مقصد ومنزل کو پیش نظر رکھ کر اپنے قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ کبھی وہ قوم کا مرثیہ لکھتے ہیں، کبھی ماضی کے اوراقِ پارینہ کو الٹتے پلٹتے ہیں۔ قوم کو غیرت وحمیت کا سبق دیتے ہیں۔ کبھی وہ ہمدرد ومعالج کی طرح قوم کی بیماریوں کی نشان دہی کر کے ان کے علاج کی کوششیں کرتے ہیں اور قوم کے مردہ جسم میں قوت عطا کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں اور انھیں تلقین کرتے ہیں:

گھر بار اپنا ہے اور نہ دولت اپنی
کنبہ اپنا، نہ ہے قرابت اپنی
اپنی نہیں کوئی چیز، یاں دو کے سوا
اک موت اپنی ہے، ایک تُربت اپنی

حالی دنیاوی جاہ ومنصب، شان وشکوہ سے بے نیازی اور آخرت کے سفر کی فکر کا درس دیتے ہیں اور کردار وعمل کی شفافیت اور بہتری پر اصرار کرتے ہیں۔ حالی کی رباعیوں کی خاص خصوصیت اُن کا اپنا مخصوص طرزِ بیان، سادگی اور سلاست ہے۔ حالی اپنے رباعیوں میں جان کی تپش، بے چینی، بے قراری کو انڈیل دیتے ہیں اور یہ سلسلہ حالی سے اقبال تک جا پہنچتا ہے۔

انتخابِ نثر

غزل

غزل کی اصلاح تمام اصناف سخن میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری ہے۔قوم کے لکھے پڑھے اوران پڑھ سب غزل سے مانوس ہیں۔ بچے، جوان اور بوڑھے سب تھوڑا بہت اس کا چٹخارا رکھتے ہیں، وہ بیاہ شادی کی محفلوں میں، وجد وسماع کی مجلسوں میں لہو ولعب کی صحبتوں میں تکیوں میں اور رمنوں میں برابر گائی جاتی ہیں۔اس کے اشعار ہر موقع اور ہر محل پر بطور سند یا تائید کلام کے پڑھے جاتے ہیں۔ جولوگ کتاب کے مطالعہ سے گھبراتے ہیں اور نثر یا نظم میں لمبے چوڑے مضمون پڑھنے کا دماغ نہیں رکھتے وہ بھی غزلوں کے دیوان شوق سے پڑھتے ہیں۔ جس آسانی سے غزل کے اشعار ہر شخص کو یاد ہو سکتے ہیں کوئی کلام یاد نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ اس میں ہر مضمون دو مصرعوں پر ختم اور سلسلہ بیان منقطع ہو جاتا ہے۔ظاہر ہے کہ جو صنف قوم میں اس قدر دائر وسائر اور مرغوب خاص وعام ہو۔اس کا اثر قومی مذاق اور قومی اخلاق پر جس قدر ہو تھوڑا ہے۔اسی لیے ہمارے نزدیک شعرا کو سب سے پہلے غزل کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔لیکن غزل کی اصلاح جس قدر ضروری ہے اسی قدر دشوار بھی ہے۔غزل میں جو عام دلفریبی ہے اصلاح کے بعد اس کا قائم رہنا نہایت مشکل ہے جو کان پٹے ٹھمری سے مانوس ہو جاتے ہیں، وہ دھرپت اور خیال سے لذت نہیں اٹھا سکتے۔ داستان سننے والوں کی اس تاریخی واقعات سے ہرگز نہیں بجھ سکتی۔ بوالہوسی اور کام جوئی کی باتوں میں جو مزا ہے وہ خالص عشق ومحبت میں ہر شخص کو حاصل نہیں ہوسکتا۔اوباش والواط کی بولی ٹھولیوں میں جو چٹخارا ہے وہ سنجیدہ باتوں میں کسی بے حس ہی کو محسوس ہوسکتا ہے جن مذاقوں پر ہزل ومطائبہ کا رنگ چڑھ جاتا ہے ان پر حکمت اور اخلاق کا منتر کارگر نہیں ہوتا۔ جو لوگ سرمہ، کاجل، کنگھی، چوٹی پر فریفتہ ہیں وہ حسن ذاتی کی حقیقت تک کیونکر پہنچ سکتے ہیں لیکن زمانہ با آواز بلند کہہ رہا ہے کہ یا عمارت کی ترمیم ہوگی یا عمارت خود نہ رہے گی۔

غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص وعام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں، جیسے

سعدی، رومی، خسرو، حافظ، عراقی، مغربی، احمد جام اور جامی وغیرہم ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔ ہم نے 'حیات سعدی' میں کسی موقعے پر بیان کیا ہے کہ ان کی غزل کا موضوع جیسا کہ ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے عشق مجازی نہ تھا بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردہ میں ظاہر کرتے یا یوں کہو کہ چھپاتے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ سے پایا جاتا ہے کہ وہ عشق و محبت کے رنگ میں شور بور تھے۔ ان کے کلام میں ضرور کوئی ایسی چیز ہے جس کو روحانیت کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان کی غزل سن کر دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا سماں دل پر چھا جاتا ہے وہ خال و خط کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے شاہد پرستی کی ترغیب نہیں بلکہ دنیا پرستی سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ شراب کی بدمستی کو دنیادار مکاروں کی ہوشیاری سے بہتر بتاتے ہیں۔ وہ رندی و بدنامی و رسوائی کو صوفیوں کی دلق ملمع اور زاہدوں کی زہد ریائی پر ترجیح دیتے ہیں وہ کوئی گناہ مکر دریا سے۔ کوئی حماقت غرور مال و جاہ سے۔ کوئی شرک خود پرستی و نفس پرستی سے اور کوئی کوئی دھوکا دُنیا سے بڑھ کر نہیں بتاتے۔ ان کا کوئی کلام اثر سے خالی نہیں۔ اور اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل سے نکلا ہے۔

ان لوگوں کی غزل گوئی بعض حیثیتوں سے قوم کی موجودہ حالت کے مناسب نہ ہو لیکن وہ اس حالت کے بالکل مناسب تھی جب کہ قوم نے دنیا کو یا دنیا نے قوم کو شکار کر رکھا تھا ان کے اشعار ان لوگوں کے حق میں تازیانہ کا حکم رکھتے تھے جو حب دنیا اور حب جاہ میں منہمک، خدا سے غافل اور بادۂ نخوت میں مدہوش تھے ان سے ظالم، طمع، حریص اور بخیل عبرت حاصل کرتے تھے۔ وہ ریا کار زاہدوں، واعظوں اور صوفیوں کی قلعی کھولتے تھے۔ وہ سادہ لوح امیروں کے عیار فقیروں کے دام تزویر سے بچاتے تھے۔ وہ اہل اللہ اور ارباب صدق و صفا کو نفس امّارہ کی چوریوں اور خیانتوں سے آگاہ اور متنبہ کرتے تھے۔

اردو میں عام طور پر یہ رنگ تو ایک آدھ کے سوا کسی کی غزل میں کبھی پیدا نہیں ہوا لیکن عاشقانہ خیالات، نیچرل اور سادہ طور پر ادا کرنے والے اردو غزل گویوں کے ہر طبقہ میں کم و بیش ہوتے رہے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ اب یہ رنگ بھی روز بروز مٹتا جاتا ہے۔ الفاظ میں صنعت اور خیالات میں رکاکت و سخافت یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے۔

مثنوی

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بہ کار آمد صنف ہے۔ کیونکہ 'غزل' یا 'قصیدہ' میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے۔ ہر قسم کے مسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ 'مسدس' میں یہ دقت ہے کہ ہر ایک بند میں چار قافیے ایک طرح کے اور دو ایک طرح کے لانے پڑتے ہیں۔ پس اس میں مسلسل مضامین ایسی خوبی سے بیان کرنے، کہ مطالب برابر بے کم و کاست ادا ہوتے چلے جائیں اور قافیوں کی نشست اور روزمرہ کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ جائے، ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ 'ترجیع بند' بھی مسلسل مضامین کی گوں کا نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ہر بند کے آخر وہی ایک ترجیع کا شعر بار بار آتا ہے جو سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیتا ہے۔ 'ترکیب بند' کے اگر تمام بندوں میں بیتوں کی تعداد برابر رکھی جائے تو بھی ایسی ہی دقت پیش آتی ہے کیونکہ اس کے ایک بند میں صرف ایک پوائنٹ عمدگی سے بیان ہوسکتا ہے۔ لیکن ہر پوائنٹ کی وسعت یکساں نہیں ہوتی بلکہ کم و بیش ہوتی ہے۔ پس ضرور ہے کہ بند بھی چھوٹے بڑے ہوں، ممکن ہے کہ ایک بند دو تین بیت کا ہو اور دوسرا پندرہ بیس بیت کا۔ اور یہ بات اس تناسب کے برخلاف ہے جو شعر کا جزوِ اعظم ہے۔

الغرض جتنی صنفیں فارسی اور اردو شاعری میں متداول ہیں ان میں سے کوئی صنف مسلسل مضامین بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں ہے۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عرب کی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔ عرب کی شاعری میں مثنوی کا رواج نہ ہونے یا نہ ہوسکنے کے سبب تاریخ یا قصہ یا انحراف یا تصوف میں ظاہراً ایک کتاب بھی ایسی نہیں لکھی جاسکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں اسی لیے عرب شاہنامہ کو قرآن العجم کہتے ہیں اور اسی لیے مثنوی کی نسبت ''ہست قرآن در زبان پہلوی'' کہا گیا ہے۔

اردو میں چند چھوٹی چھوٹی عشقیہ مثنویوں کے سوا اخلاق یا تاریخ وغیرہ میں ظاہراً آج تک کوئی چھوٹی یا بڑی کسی مسلم الثبوت استاد نے نہیں لکھی۔ عشقیہ مثنویوں کا حال بھی جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس زمانہ کے مقتضی اور مذاق سے بہ مراحل دور تر اور بعید تر ہے

جو قصے ان مثنویوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں قطع نظر اس کے کہ ناممکن اور فوق العادۃ باتیں اور حد سے زیادہ مبالغہ اور غلو بھرا ہوا ہے اکثر مثنویوں میں شاعری کے فرائض بھی پورے پورے ادا نہیں ہوئے۔ مثنوی میں علاوہ ان فرائض کے جو غزل یا قصیدے میں واجب الادا ہیں۔ کچھ اور شرائط بھی ہیں جن کی مراعات نہایت ضروری ہے۔ از انجملہ ایک 'ربط کلام' ہے جو کہ مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے، غزل اور قصیدہ میں ایک شعر کو دوسرے شعر سے جیسا کہ ظاہر ہے کچھ ربط نہیں ہوتا۔ الا ماشاء اللہ۔ بخلاف مثنوی کے کہ اس میں ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہیے جیسے زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔ اسی لیے جن لوگوں کی طبیعت پر غزلیت کا رنگ غالب آجاتا ہے، ان سے مثنوی کے فرائض اچھی طرح انجام نہیں ہو سکتے۔ باورچیوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ پتیلی پکانے والے سے دیگ اچھی نہیں پک سکتی۔ جو نسبت پتیلی کو دیگ کے ساتھ ہے۔ وہی نسبت غزل کی مثنوی کے ساتھ ہے۔ جس طرح پتیلی پکانے والے کو دیگ کے نمک پانی اور آنچ کا اندازہ معلوم نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو لوگ غزل میں منہمک ہو جاتے ہیں اور ان پر غزلیت کا رنگ چڑھ جاتا ہے وہ مثنوی کی ترتیب اور نظام سے اکثر عہدہ برآ نہیں ہوتے۔

جس نظم میں کوئی تاریخی واقعہ یا کوئی فرضی قصہ بیان کیا جاتا ہے اس میں مضمون آفرینی اور بلند پردازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے جائیں کہ اگر انھیں مطالب کو نثر میں بیان کیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ واضح اور صاف اور مربوط نہ ہو۔ البتہ نظم کا بیان نثر سے صرف اس قدر ممتاز ہونا چاہیے کہ نظم کی طرز بیان نثر سے زیادہ موثر اور دل کش و دلآویز ہو۔

پس مثنوی لکھنے والے کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ بیتوں اور مصرعوں کی ترتیب ایسی سنجیدہ ہو کہ ہر مصرع دوسرے مصرع سے اور ہر بیت دوسری بیت سے چسپاں ہوتی چلی جائے اور دونوں کے بیچ میں کہیں ایسا کھانچا باقی نہ رہ جائے کہ جب تک کچھ عبارت مقدر نہ مانی جائے تب تک کلام جیسا کہ چاہیے مربوط اور منظم نہ ہو۔

(مقدمہ شعر و شاعری)

خودنوشت سوانحِ حیات

(مولانا نے یہ تحریر ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد دکن کے نامور فاضل نواب عمادالملک (مولوی سیّد حسین بلگرامی) کی فرمائش پر لکھی تھی۔)

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام قصبۂ پانی پت جو شاہ جہان آباد (دہلی) سے جانبِ شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی، اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ، جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں، جب کہ غیاث الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری معروف بہ پیر ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی نام جو علوم متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابوایوب انصاریؓ تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ انجو ملقّب بہ آق خواجہ تک، جو غزنوی دور میں فارس کرمان و عراقِ عجم کا فرماں روا تھا، پہنچتا ہے۔

چونکہ غیاث الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کا بیٹا سلطان محمد علماء و شعرا و دیگر اہل کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا اس لیے اکثر اہل علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے۔ اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفر ہندوستان پر آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ سلطان غیاث الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنۂ پانی پت میں، اور معتد بہ اراضی سواد قصبۂ پانی پت میں بطور مدد معاش کے، اور بہت سی زمین اندرون آبادی قصبۂ پانی پت میں واسطے سکونت کے ان کو عنایت کی اور منصب قضا و صدارت و تشخیصِ نرخ بازار اور تولیت

مزارات ائمہ جو سواد پانی پت میں واقع ہیں، اور خطابت عیدین ان کے متعلق کردی۔

پانی پت میں جواب تک ایک محلّہ انصاریوں کا مشہور ہے وہ انہی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے۔

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں ''ساداتِ شہدا پور'' کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے اول سلطنت مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہان اودھ کی سرکار میں نہایت درجے کا امتیاز حاصل کیا تھا مگر زیادہ تر یہ لوگ اُسی مِلک و مددِ معاش پر قانع رہے جو سلاطین اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً ان کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آباواجداد نے، جہاں تک معلوم ہے ظاہراً کوئی خدمت دلّی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتۂ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہوگیا تھا اور میرے والد نے (۴۰ برس کی عمر میں) سن کہولت میں انتقال کیا۔ جب کہ میں نو برس کا تھا، اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

انھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سیّد جعفر علی مرحوم، جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بوجہ تعلق زناشوئی کے پانی پت میں مقیم تھے، اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں یدِطولیٰ رکھتے تھے، ان سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور ان کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہوگئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انہی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے، ان سے صرف ونحو پڑھی۔

چند روز بعد بھائی اور بہن نے جن کو میں بہ منزلہ والدین کے سمجھتا تھا۔ تاہّل پر مجبور کیا۔ اس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارا تھا کہ یہ جوا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلّی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف ونحو اور کچھ ابتدائی کتابیں، منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے، جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔

اگرچہ اس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو ونما پائی تھی، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کہیں ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے، نہ یہ کہ اس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے (جہالت کدہ) کہتے تھے۔ دلّی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا، وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا۔ ڈیڑھ برس تک دہلی میں رہنا ہوا، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ ان لوگوں سے اس زمانے میں کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ، مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دلّی میں شرح مسلم، ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و نا چار مجھ کو دہلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ء کا ہے۔ دہلی سے آکر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں بطور خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا۔

۱۸۵۶ء میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی۔

۵۷ء میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عملداری اٹھ گئی، تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزرے۔

اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلاء مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محبّ اللہ اور مولوی

قلندر علی مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ، کبھی حدیث کبھی تفسیر پڑھتا رہا، اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا اور خاص کر علم ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا اور کبھی کبھی عربی نظم ونثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا۔

جس زمانے میں میرا دلّی جانا ہوا تھا، مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اردو اور فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے، ان کے معنی ان سے پوچھا کرتا تھا اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکر شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اردو یا فارسی کی لکھ کر ان کو دکھائی تو انھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔'' مگر اس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلّی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکر معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا۔ حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے، جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص رکھتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے، شناسائی ہوگئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا۔

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اردو زبان کے شاعر تھے اس کی بہ نسبت ان کا مذاق شاعری بہ مراتب بلند تر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اردو کلام مومن خاں کو دکھایا تھا مگر ان کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے۔ میرے وہاں جانے سے ان کا پرانا شعر وسخن کا شوق، جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا اور ان کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی

طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا چمک اٹھا۔ اسی زمانے میں اردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا۔ انہی کے ساتھ میں جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر درحقیقت مرزا کے مشورے واصلاح لیے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا۔ وہ مبالغہ کو ناپسند کرتے تھے اور حقائق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دل فریب بنانا، اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بخوبی ہوسکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیے کا ذکر ہو رہا تھا۔ انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا:

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا انیس نے ناحق مرثیہ لکھا، یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا۔ ان کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا۔

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی اردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔

لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا کیا۔ یعنی ۱۸۷۴ء میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں۔

میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں، ایک برسات پر، دوسری امید پر تیسری

انصاف پر اور چوتھی حُبِ وطن پر لکھیں۔

اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا۔ یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطور خود اسی طرز کی جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی، لکھی، پھر سرسیّد احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی وتنزّل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی۔ چنانچہ میں نے اول مسدّس، مدّ وجزرِ اسلام، اور اس کے بعد اور نظمیں جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں، لکھیں۔

نظم کے سوا میں نے نثر اردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ء میں ایک کتاب 'تریاقِ مسموم' ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں، جو میرا ہم وطن تھا اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا، لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا۔

اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا بوجیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی، اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے۔

لاہور میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں کہیں جاری ہو۔

پھر دلّی میں سعدی شیرازی کی لائف اور ان کی نظم ونثر پر ریویو لکھ کر شائع کیا۔ جس کا نام 'حیات سعدی' ہے اور جس کے دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شائع ہو چکے ہیں۔

پھر شاعری پر ایک مبسوط اسّے (مضمون) لکھ کر بطور مقدّمے کے اپنے دیوان کے

ساتھ شائع کیا۔اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں ان کی فارسی اور اردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز ان کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے یادگارِ غالب کے نام سے لکھ کر شائع کی۔

اب سر سیّد احمد خاں مرحوم کی لائف موسوم بہ حیاتِ جاوید جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی، جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی۔ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گرامر وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں۔اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف اوقات میں لکھے جو تہذیب الاخلاق، علی گڑھ گزٹ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شائع نہیں ہوئی۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے، اس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی۔

میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جس کو سر سیّد کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ء میں لکھا تھا، اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شائع ہو چکی ہے۔

۱۳۰۵ھ میں جب میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرّس تھا، نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکار عالی نظام اثنائے سفر شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سر سیّد احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا۔نواب صاحب ممدوح نے بہ صیغۂ امدادِ مصنّفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتّر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سر سیّد مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیاں محمڈن کالج علی گڑھ، حیدر آباد گیا تھا، اس وظیفے میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کر کے سو روپے سکّۂ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکارِ عالی سے ملتا ہے اور اُسی وقت سے میں نے اینگلو عربک ہائی اسکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے۔

(منقولہ: ارمغان حالی، از پروفیسر حمید احمد خاں، لاہور، ص ۱ تا ۹)

سیّد احمد خاں کی انسانی عظمت کا بیان

ہمارے ملک میں ترقی کا لفظ زیادہ تر عہدہ یا منصب کی ترقی پر اطلاق کیا جاتا ہے مگر اس موقع پر نہ ایسی ترقی سے ہماری غرض متعلق ہے اور نہ ہمارے نزدیک سرسید نے عہدہ یا منصب کے لحاظ سے ترقی کا کوئی ایسا درجہ حاصل کیا ہے جو ان کی اعلیٰ لیاقتوں کے مقابلہ میں کچھ وزن رکھتا ہو۔

یہاں سرسید کی جس ترقی کے اسباب بیان کرنے مقصود ہیں وہ عہدہ اور منصب کی ترقی نہیں بلکہ وہ ترقی ہے جو بعض اوقات کسی شخص کو نہ عہدہ اور منصب کے لحاظ سے اور نہ مال و دولت و جاہ حکومت کے اعتبار سے بلکہ اعلیٰ و اشرف خصائل انسانی کے لحاظ سے نہ صرف اپنے خاندان میں بلکہ تمام قوم اور ملک میں ممتاز کر دیتی ہے۔

سرسید کی زندگی کے واقعات کو محض سرسری طور پر دیکھا جائے تو بھی ان سے اس قدر ضرور ثابت ہوگا کہ ایک مسلمان جو قومی تنزل کے زمانہ میں پیدا ہوا، جس نے ایک مردہ دارالخلافہ کی پژمردہ سوسائٹی میں ہوش سنبھالا اور ہندوستان کی کمزور آب و ہوا میں نشو ونما پائی، اس نے اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ نہایت جانکاہ محنت، دلی شوق اور بے نظیر استقلال کے ساتھ گورنمنٹ کی خیر اندیشی، ملک کی خیر خواہی، قوم کی خدمت اور مذہب کی حمایت میں بسر کر دی۔ پس اس مقام پر ضرور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس چیز نے یہ غیر معمولی تحریک اس کے دل میں پیدا کی؟ اور کیوں کر وہ اس قدر طول طویل زمانے تک ایسے استقلال کے ساتھ اپنے ارادوں پر قائم رہا؟ اگر چہ اس سوال کے جواب میں صرف یہ کلام معجز نظام پیش کرنا کافی ہے کہ ''کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ'' (یعنی ہر شخص کو اس کام میں جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے آسانی دی گئی ہے) لیکن چونکہ سرسیّد کی بائیوگرافی کو ہم آئندہ نسلوں کے لیے

ایک مثال قابل تقلید سمجھتے ہیں اس لیے ان کی ترقی کے اسباب کی تفتیش کرنا غالباً فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

سرسید کی لائف میں جیسا کہ ان کے ابتدائی حالات پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے بہت سی ایسی خصوصیتیں پائی جاتی ہیں جن پر ان کی ترقیات کی بنیاد قائم کی جاسکتی ہے۔ قطع نظر ان جسمانی اور اخلاقی قابلیتوں کے جن کے بخشنے میں قدرت نے بہت بڑی فیاضی کی تھی اور جن کے بغیر کوئی شخص بڑا آدمی نہیں ہوسکتا۔ اتفاقات حسنہ نے بھی ان کے ساتھ کچھ کم مساعدت نہیں کی۔ وہ ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جس میں قدیم خاندان کی نیکیاں اور نئے خاندان کی اولوالعزمی اور ہمت مجتمع تھی۔ ان کی ددھیال سلطنت کے ایک قدیم متوسل گھرانے کی یادگار تھی اور ان کی ننھیال ایک ایسے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی جس نے اپنی ذاتی لیاقت، حسن تدبیر اور علم و فضل سے اپنے اقران و امثال میں امتیاز حاصل کیا تھا، اور اپنے تئیں زمانہ کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ وہ خوش قسمتی سے بچپن میں زیادہ تر اپنی ننھیال ہی میں رہے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ انھوں نے اپنے نانا کا عہد اپنی آنکھ سے دیکھا اور اپنے لائق ماموؤں کی صحبت برتی۔ ان کی ماں ایک نیک نہاد سنجیدہ اور دانشمند بی بی تھیں۔ جن کی تعلیم و تادیب سرسیّد جیسے جوہر قابل کے لیے اکسیر کا حکم رکھتی تھی۔ انھوں نے حسن اتفاق سے ایسی حالت میں نشو و نما پائی کہ نہ ان کی حد سے زیادہ روک ٹوک ہوئی اور نہ ان کو بالکل مطلق العنان چھوڑا گیا، وہ پڑھتے لکھتے بھی تھے اور ہر قسم کے کھیل بھی کھیلتے تھے مگر اپنے رشتہ داروں کے سوا غیر جنس کے لڑکوں سے کبھی نہ ملنے پاتے تھے، نہ ان پر تعلیم کا ایسا بوجھ ڈالا گیا تھا کہ قوائے جسمانی مضمحل ہو جائیں، اور نہ ان کی ڈور ایسی ڈھیلی چھوڑی گئی تھی کہ جدھر منہ اٹھ گیا چل نکلے۔

ان کے والد ایک آزاد منش اور تعلقات دنیوی سے الگ تھلگ رہنے والے آدمی تھے۔ گھر کے انتظام اور اولاد کی پرورش اور تربیت کا مدار زیادہ تر بلکہ بالکل سرسید کی والدہ پر تھا۔ جو باوجود طنطنہ اور رعب داب کے نہایت متحمل اور بردبار تھیں۔ پس وہ بے جا تشدد اور سختی جو اولاد کی تعلیم و تربیت کے زمانہ میں اکثر والدین سے ظہور میں آتی ہے اور جس سے

رفتہ رفتہ اولاد کے دل میں خود اپنی حقارت اور ذلت بیٹھ جاتی ہے، سرسیّد پر کبھی نہیں گزری۔

جوانی کے آغاز میں سرسید کو بچپن کی نسبت کسی قدر زیادہ آزادی حاصل ہوئی۔ وہ اکثر رنگین جلسوں میں شریک ہونے لگے اور شہر کے نوجوان امیر زادوں سے ملنے جلنے لگے۔ سوسائٹی کا پرچھاواں ان پر بھی پڑا اور پڑنا چاہیے تھا۔ مگر ہونہار نوجوان کی لغزشیں بھی ان کی اصلاح کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ ایک ٹھوکر کھا کر ایسے چوکنا ہو جاتے ہیں کہ پھر کبھی عمر بھر ٹھوکر نہیں کھاتے۔ بھائی کی عبرت انگیز موت سے دل پر ایسی افسردگی چھائی کہ ہمیشہ کے لیے لہو ولعب سے دست بردار ہونا پڑا۔ مگر چونکہ طبیعت میں آتش گیر مادہ بھرا ہوا تھا وہ آخر کار مشتعل ہوئے بغیر نہ رہا۔ وہی سودا جو عنفوانِ شباب میں ہوا و ہوس کی شکل میں ظاہر ہوا تھا بیس برس بعد حب قومی کے لباس میں جلوہ گر ہوا اور میرؔ کا یہ شعر سرسید کے حال پر منطبق ہو گیا:

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا

جس حد تک سرسید کی تعلیم ہوئی اس کو بھی ان کی ترقی کا مؤید سمجھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے جیسا کہ پہلے حصہ میں بیان ہو چکا ہے قدیم یا جدید کسی طریقہ میں پوری تعلیم نہیں پائی۔ اگر وہ پرانے طریقہ کی تعلیم پوری کر لیتے اور علوم قدیمہ کا رنگ ان پر چڑھ جاتا پھر ممکن نہ تھا کہ کسی دوسرے رنگ کے قبول کرنے کی قابلیت ان میں باقی رہتی۔ وہ تقلید کی بندشوں میں جکڑ بند ہو جاتے اور تعصب کے توبرتو پردے ان کی آنکھوں پر پڑ جاتے۔ نئے طریقے کی تعلیم بھی ان نتائج تک پہنچانے والی نہ تھی جو سرسید سے ظہور میں آئے یورپ کی اعلیٰ درجہ کی سویلزیشن اور حیرت انگیز ترقیات جو ایک ہندوستانی طالب علم کے دل پر تعلیم کے ساتھ ساتھ نقش ہوتی جاتی ہیں وہ آخر کار اس کو اپنے ملک کی ترقی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان کوششوں کو جو ہندوستانیوں کی ترقی اور اصلاح کے لیے کی جاتی ہیں محض بے سود اور لاحاصل جاننے لگتا ہے پس کہا جا سکتا ہے کہ سرسید کا پرانی تعلیم میں ادھورا رہنا اور نئی تعلیم سے آشنا نہ ہونا منجملہ ان اتفاقات حسنہ کے تھا، جنھوں نے قوم کی اصلاح کے عظیم

الشان کام پر ہاتھ ڈالنے سے ان کو جھجکنے نہیں دیا۔

اگر چہ یہ تمام باتیں جو اوپر بیان کی گئیں بلا شبہ ایسی ہیں جن کو سرسید کی ترقی میں بہت کچھ دخل معلوم ہوتا ہے مگر ان میں سے ایک بات بھی ایسی نہیں جس کو ان کی ترقی کے اسباب میں شمار کیا جائے کیونکہ یہی باتیں اکثر اوقات ترقی کی سدّ راہ دیکھی گئی ہیں۔ اس کے سوا ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے اور خاص کر ہماری مردہ قوم میں جس قسم کے حیرت انگیز اور عظیم الشان کام سرسید سے ظہور میں آئے ہیں اور جیسی جلیل القدر خدمتوں میں انھوں نے اپنی زندگی کا ایک معتد بہ حصہ نہایت استقلال کے ساتھ بسر کیا ہے۔ ان کو محض اتفاقیہ امور کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔

بعض اوقات خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید کا اپنی بی بی کے انتقال کے بعد دوسری شادی نہ کرنا اور چالیس برس تجرد اور بے تعلقی کی حالت میں رہنا یہی ان کے تمام بڑے بڑے کاموں کی بنیاد تھی۔ اگر وہ دوسرا نکاح کر لیتے تو ہرگز ان کو ان کاموں کے سرانجام کرنے کا موقع نہ ملتا۔ مگر اس تقدیر پر یہ سوال باقی رہتا ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس نے ایک چالیس بیالیس برس کے توانا تندرست، ذی استطاعت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان شخص کو نکاح ثانی سے باز رکھا اور تجرد کی ناگوار اور تلخ زندگی پر قانع کر دیا؟

البتہ ایک اور بات لحاظ کے قابل ہے جو سرسید کی لائف پر غور کرتے وقت لوگوں کے ذہن میں ضرور متبادر ہوتی ہوگی یعنی یہ کہ جب سے انگریزی تعلیم ہندوستان میں پھیلی ہے اور یورپ کے ان نامور لوگوں کے حالات سے جنھوں نے ملک اور قوم پر اپنی جانیں قربان کی ہیں ہندوستان کے لوگ واقف ہوئے ہیں اس وقت سے ہندوستان میں بھی کم و بیش قومیت اور قومی ہمدردی کا خیال لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ پس یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ سرسیّد نے بھی جو کچھ ملک یا قوم یا مذہب کی خدمت میں کیا وہ انھیں یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات سن کر ان کی ریس سے کیا ہو، لیکن اول تو جس وقت سرسیّد کو ملک اور قوم کی خدمت یا مذہب کی حمایت کا خیال پیدا ہوا اس وقت تک انگریزی تعلیم ہندوستان میں نہایت محدود تھی اور مسلمانوں میں بالکل نہ تھی۔ دوسرے اگر بالفرض یہ بات

مان بھی لی جائے تو صرف اسی قدر مانی جا سکتی ہے کہ یورپ کی تاریخ سے ان کے دل میں بھی حبِ وطن اور قومیت کا خیال ایسا ہی پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں ایک دودھ کا سا اُبال پیدا ہو جاتا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خیال ایسا پک جائے کہ ایک ہندوستان کا مسلمان قوم کی دھن میں اپنے تئیں فنا کر دے۔ جس طرح حالت موجودہ میں یہ ممکن نہیں کہ یورپ کے موجدوں اور مخترعوں کے حالات سن سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی موجد اور مخترع پیدا ہونے لگیں۔ اسی طرح یہ بھی امکان سے خارج ہے کہ یورپ کے ریفارمروں اور وطن دوستوں کے حالات کتابوں میں پڑھ کر یا زبانی سن کر ہندوستان میں بھی ویسے ہی ملک کے جاں نثار اور قوم کے مصلح پیدا ہو جائیں۔

چونکہ سرسید کا خاندان دو ایسے خاندانوں سے عقیدت رکھتا تھا جو نہ صرف دلّی بلکہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں۔ چنانچہ سرسید کہتے تھے کہ:

> ''اس زمانہ میں بھی جب کہ میرے مذہبی خیالات محققانہ اصول پر مبنی ہیں میں اپنی والدہ کے عقائد میں ایک آدھ بات کے سوا کوئی عقیدہ اپنے اصول کے خلاف نہیں پاتا۔''

یہی عقائد ابتدا سے سرسید کے دل میں ڈالے گئے تھے اور اسلام کی یہی صورت انھوں نے آنکھ کھول کر دیکھی تھی۔ گویا ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اپنا قدم تحقیق کی پہلی سیڑھی پر پایا تھا۔ پھر مولانا اسماعیل شہیدؒ کی تصنیفات نے ان کے خیالات کی اور زیادہ اصلاح کی اور ان کو کسی قدر تقلید کی بندشوں سے آزاد کیا۔ مگر جب تک قدیم سوسائٹی کا رنگ ان پر غالب رہا۔ مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا، وہ انھیں سنت و بدعت و تقلید و عدم تقلید کے جھگڑوں میں الجھے رہے اور اسلام کے اشرف و اعلیٰ مقاصد کو صرف انھیں شخصی کاموں میں منحصر جانتے رہے جن کا نفع یا تو خود کام کرنے والے کی ذات کو اور یا خاص خاص شخصوں کو پہنچتا ہے مگر آخر کار زمانہ کی ضرورتوں نے ان کی آنکھیں کھولیں اور

خود اس یقین نے جو اسلام کی حقیقت کی نسبت ان کی گھٹی میں پڑا تھا، ان کو اسلام کی حقیقت اور اس کے اصلی مقاصد تک پہنچا دیا۔ جو باتیں دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے خلاف معلوم ہوئیں ان کو چھوڑا اور جو اس کے مطابق پائیں ان کو پکڑا اور زید و عمرو کی مخالفت کا خوف یک قلم دل سے اٹھا دیا۔ ہر ایک معاملہ میں خود مذہب کو نہ کہ زید و عمرو کو اپنا رہبر بنایا، جو سوال پیش آیا اس کو بلا واسطہ مذہب ہی سے پوچھا اور جو کچھ وہاں سے جواب ملا اس کو سر پر رکھا۔ لوگ انگریزی نوکری پر اعتراض کرتے تھے مگر مذہب نے اجازت دی اس لیے انگریزی نوکری بے تامل اختیار کر لی۔ مذہب ہی سے یہ سوال کیا کہ غیر قوم اور غیر مذہب گورنمنٹ کی نوکری محض دفع الوقتی وایام گزاری کے طور پر کرنی چاہیے؟ یا تہ دل سے اس کے فرائض ادا کرنے چاہئیں؟ مذہب نے جواب دیا کہ نوکری کا پورا معاوضہ لینا اور اس کے فرائض تہ دل سے ادا نہ کرنا خدا اور رسول کی مرضی کے خلاف ہے اس لیے نوکری کے فرائض نہایت ایمانداری اور سچائی کے ساتھ سرانجام کیے۔ مذہب ہی سے پوچھا کہ غیر قوم کی حکومت میں رعیت کو اس کی خیر خواہ اور وفادار رعایا بن کر رہنا ضروری ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ کوئی گناہ اس سے بڑھ کر نہیں کہ جس گورنمنٹ کے سایۂ حمایت میں رعیت کو ہر طرح کا امن و آزادی حاصل ہو۔ اُس کی رعیت اپنی گورنمنٹ کی وفادار اور خیر خواہ نہ ہو، لہٰذا اپنی تمام زندگی گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں صرف کر دی۔ مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ غیر مذہب قوموں کے ساتھ صدق دل سے دوستی، میل جول اور کھانا پینا، دین حق کی پاکیزگی اور تقدس کے موافق ہے یا نہیں۔ مذہب نے جواب دیا کہ موافق ہی نہیں بلکہ نہایت ضروری ہے کیونکہ اسلام نفاق سے بدتر اور رذیل تر کسی خصلت کو نہیں بتاتا اس لیے ہمیشہ انگریزوں اور تمام غیر مذہب قوموں کے ساتھ اسی صداقت اور خلوص کے ساتھ میل جول رکھا، جیسا کہ مسلمانوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔

واقعۂ ۱۸۵۷ء نے جب ہندوستان کے مسلمانوں کو نہایت سخت صدمہ پہنچایا اور ان کے پنپنے کی بالکل امید نہ رہی اس سے سرسید کے دل پر ایسی افسردگی اور مایوسی چھائی کہ ان کا ارادہ ہندوستان سے تعلقات قطع کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر رہنے کا ہو گیا۔

اس وقت بھی انھوں نے مذہب ہی سے سوال کیا کہ قوم کی آگ میں کودنا بہتر ہے یا اپنی جان بچا کر اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر خدا کی یاد کرنی بہتر ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ اسلام کا اصل اصول بلکہ خود اسلام محض قوم کی خیر خواہی اور ہمدردی ہے اور بس۔ مذہب نے ان کو بتایا کہ بانیٔ اسلام جس کی اطاعت اور اتباع تمام امت پر فرض ہے اور جس کی نسبت قرآن ناطق ہے کہ "لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" اس نے دنیا میں آ کر کیا کیا؟ اپنی تمام عمر ملک اور قوم کی خیر خواہی میں بسر کی، وہ گمراہ تھے ان کو ہدایت کی، وہ وحشی تھے ان کو انسان بنایا، وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے، ان میں اخوت اور دوستی کی بنیاد ڈالی، وہ آپس کی خانہ جنگیوں میں پھنسے ہوئے تھے ان میں ملک گیری اور کشور کشائی کا مادّہ پیدا کیا، ان کا دین اور دنیا دونوں درست کیے، ان کی خیر خواہی اور اصلاح میں سخت شدائد اور تکلیفیں اپنے نفس پر برداشت کیں، ملک کی محبت کو جزو ایمان قرار دیا اور کہا کہ "حب الوطن من الایمان." قوم کی محبت پر تمام امت کو مجبور کیا اور فرمایا "حب العرب من الایمان" قوم کی سرداری کو قوم کی خدمت میں منحصر ٹھیرایا اور کہا کہ "سید القوم خادمھم" اخیر دم تک امت یعنی قوم ہی کا خیال رکھا اور "امتی امتی" کہتا ہوا دنیا سے رخصت ہوا۔

سر سیّد نے مذہب کی یہ ہدایت سن کر تمام ارادے فسخ کیے اور اس اصول کو مضبوط پکڑ لیا۔ انھوں نے دنیوی تعلقات کو جن کے بغیر قوم کی خیر خواہی اور قوم کو نفع پہنچانا غیر ممکن تھا قطع تعلق سے ہزار درجہ بہتر سمجھا اور اپنی تمام زندگی اور طاقت اور استطاعت اور اپنے تمام قویٰ کو نفس واپسیں تک قومی خدمت اور قومی خیر خواہی کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے مذہب ہی سے یہ پوچھا کہ قوم کی اصلی اور حقیقی خیر خواہی کس چیز میں ہے؟ مذہب نے جواب دیا کہ مسلمانوں کے اعزاز سے اسلام کو معزز کرنا اور دنیا کے ذریعہ سے دین کو تقویت دینی۔ مذہب ہی نے ان کے دل میں ڈالا کہ مسلمان دنیوی عزت میں حد سے زیادہ گرے ہوئے ہیں اور گرتے چلے جاتے ہیں اور مسلمانوں کی ذلت بعینہٖ اسلام کی ذلت ہے۔ اگر چند روز ان کا یہی حال رہا تو ہندوستان میں ان کا عدم اور وجود برابر ہو جائے گا اور اسلام اس

ملک سے رخصت ہو جائے گا اس لیے انھوں نے قوم کو اول دنیا ہی کی طرف متوجہ کیا اور جو ذریعے ان کی دنیوی ترقیات کے تھے ان کے لیے مہیا کیے۔ سب سے زیادہ ان کی ترقی کا مدار انگریزی تعلیم پر سمجھا۔ اس لیے گو ایک زمانے نے انگریزی تعلیم کی مخالفت اور مزاحمت کی مگر انھوں اس قوم میں جاری کر کے چھوڑا۔ مذہبی اوہام اور غلط خیالات جو دنیوی ترقی کے مانع تھے اپنی پرزور تحریروں سے ان کی غلطی ثابت کی سوشل اور اخلاقی خرابیاں جو قوم میں شائع تھیں، جن پر غیر قومیں ہنستی تھیں اور جو دنیوی عزت اور وقار کی منافی تھیں ان کی اصلاح میں جہاں تک ممکن تھا کوشش کی، قوم کی طرف سے جو گورنمنٹ کو پولیٹیکل بدگمانیاں تھیں ان کو رفع کیا۔ گورنمنٹ کی طرف سے جو قوم کے دل میں مغائرت یا دہشت یا جھجک تھی اس کو دور کیا۔ انگریز جو اسلام کو ایک نہایت مہیب اور خوفناک مذہب خیال کرتے تھے اور اس لیے مسلمانوں کی طرف سے مطمئن نہ تھے ان کو اسلام کی اصلی صورت دکھائی اور ثابت کیا کہ اگر دنیا میں کوئی مذہب عیسائیوں کا دوست عیسائی مذہب کا حامی، بائبل کی تصدیق کرنے والا اور اس کے اصول سے مطابقت رکھنے والا ہے تو وہ صرف اسلام ہے اور بس۔ ہندو مسلمانوں میں جہاں تک کہ ممکن تھا اتحاد و اتفاق پیدا کرنے میں کوشش کی۔ کیونکہ دونوں قوموں کی عزت اسی بات پر موقوف تھی اور موقوف ہے کہ آپس میں مل جل کر رہیں۔ جتنے مدرسے، انسٹی ٹیوشن قائم کیے ان میں دونوں قوموں کو شریک کیا اور ان سے دونوں کے فوائد ملحوظ رکھے۔ ہمیشہ اپنی پبلک اسپیچوں میں دونوں قوموں کو اسی بات کی نصیحت کی کہ ہندوستان کی عزت اتفاق میں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے جن میں مذہبی نزاع اور جھگڑوں نے پھوٹ ڈال رکھی ہے اور اس لیے وہ روز بروز ضعیف اور حقیر ہوتے جاتے ہیں جہاں تک ممکن تھا ان میں اتفاق والتیام کی بنیاد ڈالی۔ مدرسۃ العلوم میں ہر مسلمان فرقہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا اور ہر فرقہ کے طالب علموں کو ایک مسجد میں نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ اپنے سنّی دوستوں کو شیعوں کے خلاف کتابیں لکھنے سے روکا اور خود جو ابتدائی عمر میں اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کی تھی اس سے ہمیشہ کے لیے اجتناب کیا۔ باوجود کہ ان کو اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے مذہب کے متعلق صدہا باتیں جمہور کے خلاف لکھنی پڑیں، مگر بغیر سخت

ضرورت کے کبھی کوئی نئی بات زبان سے نہیں نکالی۔ کبھی جمہور اہل اسلام کے مقابل کوئی جدید فرقہ کھڑا کرنا اور آپ اس کا سرگروہ بننا نہیں چاہا۔ کبھی مخالفین کے اعتراضات کا جواب پلٹ کر نہیں دیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ قوم میں اختلاف اور نزاع بڑھنے نہ پائے اور میل کا بیل نہ بن جائے۔

جس وقت سرسیّد نے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم جاری کرنے کا ارادہ کیا اس وقت مذہب نے ان کو اس یقین پر قائم رکھا کہ جو صدمہ یورپ میں عیسائی مذہب کو تعلیم سے پہنچا ہے وہ اسلام کو ہرگز نہیں پہنچ سکتا، اور جب کہ انگریزی تعلیم ان میں جاری ہوگئی اور اس کو روز بروز ترقی ہونے لگی، اس وقت بھی مذہب ہی ان کو یہ سمجھایا کہ جب تک سائنس اور اصول اسلام میں تطبیق نہ کی جائے تب تک ان کورے اور سادہ لوح طالب علموں کی طرف سے اطمینان نہیں ہوسکتا جو مذہبی تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں اور اس لیے ان کے دل میں مذہب کی طرف سے سوئے ظن پیدا ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے۔ مذہب نے ان کو ڈرایا کہ اگر تعلیم سے اسلام کو کچھ صدمہ پہنچا تو اس کا مظلمہ خاص کر اس شخص پر ہوگا جس نے قوم میں تعلیم جاری کی۔ چنانچہ اس عظیم الشان کام کو بھی انھوں نے اپنے ذمہ لیا اور اپنی سمجھ اور علم وعقل کے موافق قرآن کی تفسیر لکھنی شروع کی۔

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا یہ محض بے سروپا قیاسات نہیں ہیں بلکہ خود سرسید نے اپنی تحریروں میں جا بجا اس مضمون کی طرف اشارہ کیا ہے۔ خصوصاً وہ آرٹیکل جو تہذیب الاخلاق، مورخہ یکم ربیع الاول ۱۲۸۸ھ میں ''ایک نادان خدا پرست اور دانا دنیا دار'' کے عنوان سے لکھا ہے اس سے ہمارے مذکورہ بیانات کی بخوبی تائید ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ہم ہمیشہ اپنی آنکھ سے دیکھتے تھے کہ سرسید قومی خدمات اسی سرگرمی اور ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیتے تھے جیسے ایک مرتاض اور نفس کش زاہد عبادت الٰہی بجا لاتا ہے۔ نہ بیماری اور ضعیفی ان کے ذوق وشوق کو کم کرتی تھی اور نہ گرمی یا سردی کی شدت یا کسی ہرج مرض سے۔ ان کی ہمت قاصر ہوتی تھی۔ چالیس برس برابر انھوں نے مخالفتیں جھیلیں، ان کے کفر کے بے شمار فتوے لکھے گئے، ان کو دہری، ملحد، کافر اور دجال سب کچھ کہا گیا۔ ان کو بارہا قتل

کی دھمکیاں دی گئیں۔صدہا گمنام خطوں میں مغلظ گالیاں لکھ کر بھیجی گئیں۔اخباروں اور رسالوں میں جہاں تک ہوسکا ان کی توہین کی گئی۔مگر وہ اپنی دھن میں اسی طرح لگے رہے اور اپنا کام اسی ذوق وشوق کے ساتھ کیے گئے بلکہ جس قدر مخالفت بڑھتی گئی اسی قدر ان کا جوش اور سرگرمی زیادہ ہوتی گئی۔لوگ ان کا برا کہہ کر اور گالیاں دے کر اس قدر خوش نہ ہوتے ہوں گے جس قدر کہ وہ برا سن کر اور گالیاں کھا کر خوش ہوتے رہے۔ان کی بہن کے انتقال کی خبر ان کو اس وقت پہنچی جب کہ وہ قومی کانفرنس کی کارروائی میں مصروف تھے۔ جب تک جلسہ اپنے معمولی وقت پر برخاست نہ ہوا وہ بہن کی تجہیز وتکفین میں شریک نہ ہوئے۔جوان بیٹے کی موت سے ان کو سخت صدمہ پہنچا، پندرہ بیس روز تک قلب کی حرکت نہایت سست رہی اور یہ صدمہ آخر تک فراموش نہ ہوا۔

باایں ہمہ وہ اپنی قومی خدمات میں برابر مصروف رہے اور ایک رات اور ایک دن سے زیادہ جو کہ دلّی کی آمد ورفت میں صرف ہوا انھوں نے باوجود ایسے سخت صدمہ کے کوئی قومی کام ملتوی نہیں کیا اور ایسے مواقع کو تا بمقدور کبھی پاس نہیں آنے دیا جن سے بیٹے کا داغ تازہ ہو اور قومی خدمات میں حرج واقع ہو۔

دہلی میں انہی خیالات سے وہ جنازہ کے ساتھ نہ گئے اور دفن کرنے میں شریک نہیں ہوئے۔لوگوں کو سخت تعجب ہوا اور بعضوں نے بڑے بڑے اعتراض کیے، اور حق یہ ہے کہ ان کے اعتراض بالکل بجا تھے کیونکہ "من جهل شيأ اعداه" الغرض یہ سب باتیں شہادت دیتی ہیں ان کے تمام کاموں کی محرک کوئی ایسی روحانی امنگ تھی جس پر دنیا کے معمولی خلجان غالب نہیں آسکتے تھے اور جس قدر جسمانی امنگیں کم ہوتی تھیں وہ امنگ بڑھتی جاتی تھیں۔

اس مقام پر یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ سرسید کی فطرت میں جیسا کہ ان کے حالات اور ان کے کاموں سے معلوم ہوتا ہے غایت درجہ کی فراخ، حوصلگی اور کشادہ دلی تھی یہاں تک کہ بعض اشخاص غلطی سے ان کو حد سے زیادہ مسرف اور فضول خرچ خیال کرتے تھے۔جو لوگ ان کے حالات سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ جب تک مسلمانوں میں

تعلیم پھیلانے کے خیال ان کے دل میں پیدا نہیں ہوا تھا، وہ ہمیشہ اپنی بساط سے بہت بڑھ کر غریبوں اور مسکینوں کے ساتھ سلوک کرتے تھے اور کبھی ان کی آمدنی میں سے ایک حبّہ پس انداز نہ ہوتا تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے ان کو تعلیم اہل اسلام کا خیال ہوا انھوں نے اس قسم کے شخصی سلوک اور احسان بالکل بند کر دیے جو کچھ ان کے ضروری اخراجات سے بچا وہ انھوں نے مدرسہ کے سوا اور کہیں صرف نہیں کیا۔ سائل ان کے دروازہ سے ہمیشہ ناکام پھرتے تھے، تعلیم کے سوا کسی اور رفاہ عام کے چندہ میں بھی وہ شریک نہیں ہوتے تھے۔ بخلاف اس کے مدرسہ کی امداد میں وہ اپنی طاقت اور استطاعت سے بمراتب بڑھ کر خرچ کرتے رہتے تھے۔ غدر سے پہلے جب کہ وہ بجنور میں صدر امین تھے انھوں نے کئی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کرائی، اپنے پاس سے بھی روپیہ صرف کیا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں سے بھی لے کر لگایا، مگر غدر کے بعد جب سہارن پور کی جامع مسجد کے لیے ان سے چندہ طلب کیا گیا تو انھوں نے چندہ دینے سے صاف انکار کیا اور لکھ بھیجا کہ ''میں خدا کے زندہ گھروں کی تعمیر کی فکر میں ہوں اور آپ لوگوں کو اینٹ مٹی کے گھر کی تعمیر کا خیال ہے۔''

ان باتوں سے صاف پایا جاتا ہے کہ سرسید کی کل مذہب کے ہاتھ میں تھی۔ مذہبی جہاں چاہتا تھا۔ ان سے خرچ کراتا تھا اور جہاں چاہتا تھا۔ ان کا ہاتھ روک دیتا تھا کیونکہ مذہب کے سوا کوئی ایسا زبردست حاکم نہیں ہے جو انسان کی طبیعت کے اقتضا پر غالب آجائے اور ایک ہی شخص کو ہمیشہ کے لیے ایک جگہ غایت درجہ کا فیاض اور دوسری جگہ حد سے زیادہ ممسک اور تنگ دل بنا دے، جیسا کہ بعض صحابہ کا حال تھا کہ کہیں ان کی داد و دہش کے آگے حاتم کی فیاضی ہیچ معلوم دیتی تھی اور کہیں ان کی کفایت شعاری اور جز رسی پر حد سے زیادہ تعجب ہوتا تھا۔

اگرچہ اس میں شک نہیں کہ سرسید نے جتنے بڑے بڑے کام کیے وہ عقل سلیم اور رائے صائب کی ہدایت سے کیے اور اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے کارہائے نمایاں ان کی دانشمندی اور رائے صائب کے نتیجے تھے نہ مذہب کے لیکن اول تو جو شخص مذہب اور عقل کو لازم و ملزوم جانتا ہو اس کے کسی کام کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عقل کا نتیجہ تھا نہ مذہب

کا۔ دوسرے عقل کا کام صرف اس قدر ہے کہ وہ راہ راست بتا دیتی ہے مگر اس راہ پر چلنا اور ثابت قدم رہنا اور نہایت استقلال کے ساتھ اس کی تمام منزلیں طے کرنا جب تک کہ مذہب کا سہارا نہ ہو، غیر ممکن ہے۔

اس بحث کو جو ہم نے اس قدر طول دیا ہے اس سے شاید لوگوں کو یہ خیال ہو کہ ہم سرسید کے مخالفوں کو ان کے مسلمان یا پابند مذہب ہونے کا یقین دلانا چاہتے ہیں مگر فی الواقع ہمارا یہ مقصد نہیں ہے کیونکہ جس مذہب کو سرسید مذہب سمجھتے تھے اور جس اسلام کو وہ اسلام جانتے تھے مخالفوں کے نزدیک نہ وہ مذہب، مذہب تھا اور نہ وہ اسلام، اسلام۔ بلکہ ہمارا مقصد اس طولانی بحث سے صرف اس بات کا ظاہر کرنا ہے کہ ایشیائی ممالک میں جہاں وطنیت اور قومیت کا خیال بالکل نہیں ہے، جو شخص مذہب کا پابند بھی نہ ہو وہ ہرگز ملک یا قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ پس ہماری قوم کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو جو قومی ہمدردی کا دم بھرتے ہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک وہ اسلام پر ثابت قدم نہ ہوں گے ممکن نہیں کہ قوم کی بھلائی کا کوئی بڑا کام کر سکیں۔

(حیات جاوید)

○

مرزا غالب کے اخلاق و عادات

وسعت اخلاق

مرزا کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر ایک شخص سے جو اُن سے ملنے جاتا تھا بہت کشادہ پیشانی سے ملتے تھے، جو شخص ایک دفعہ اُن سے مل آتا تھا اُس کو ہمیشہ ان سے ملنے کا اشتیاق رہتا تھا۔ دوستوں کو دیکھ کر وہ باغ باغ ہو جاتے تھے اور ان کی خوشی سے خوش اور ان کے غم سے غمگین ہوتے تھے، اس لیے ان کے دوست ہر ملت اور ہر مذہب کے نہ صرف دہلی میں بلکہ تمام ہندوستان میں بے شمار تھے۔ جو خطوط انھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں ان کے ایک ایک حرف سے مہر و محبت و غم خواری و یگانگت ٹپکی پڑتی ہے۔ ہر ایک خط کا جواب لکھنا وہ اپنے ذمہ فرض عین سمجھتے تھے۔ ان کا بہت سا وقت دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنے میں صرف ہوتا تھا۔ بیماری اور تکلیف کی حالت میں بھی وہ خطوں کے جواب لکھنے سے باز نہ آتے تھے۔ وہ دوستوں کی فرمائشوں سے کبھی تنگدل نہ ہوتے تھے۔

غزلوں کی اصلاح کے سوا اور طرح طرح کی فرمائشیں ان کے بعض خالص و مخلص دوست کرتے تھے اور وہ ان کی تعمیل کرتے تھے۔ لوگ ان کو اکثر بیرنگ خط بھیجتے تھے مگر ان کو کبھی ناگوار نہ گزرتا تھا۔ اگر کوئی شخص لفافے میں ٹکٹ رکھ کر بھیجتا تھا تو سخت شکایت کرتے تھے۔ انھوں نے میسور کے ایک شہزادے کو اپنی کوئی کتاب بھیجی ہے اس نے کتاب کی رسید لکھی ہے اور قیمت دریافت کی ہے اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

''حرف پرسشِ مقدار قیمت چرا بر زبان قلم رفت؟ ہنجارِ نوازش نیاز

مندان بے نوانہ اینست ۔ بے سرمایہ ام نہ فرومایہ۔ سخنورم نہ سوداگر، موئینہ پوشم نہ کتاب فروش۔ پذیرندۂ عطایم نہ گیرندۂ بہا۔ ہر چہ آزادگاں بہ شہزادگاں فرستند نذرست وہر چہ شاہزادگاں بہ آزادگاں بخشند تبرک، بیع و شرانیست، چون و چرانیست ہر چہ فرستادہ ام ارمغان است۔ وہر چہ خواہم فرستادارمغاں خواہد بود۔"

مروّت

مروت اور لحاظ مرزا کی طبیعت میں بدرجۂ غایت تھا۔ باوجودیکہ اخیر عمر میں وہ اشعار کی اصلاح دینے سے بہت گھبرانے لگے تھے، باایں ہمہ کبھی کسی کا قصیدہ یا غزل بغیر اصلاح کے واپس نہ کرتے تھے۔ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"جہاں تک ہوسکا احباب کی خدمت بجالایا۔اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا اوراصلاح دیتا تھا۔اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بوعلی قلندر کو بسبب کبرسن کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کردی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست بھی خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہوسکے گا لکھ دیا کروں گا۔"

باوجوداس کے بھی لوگ مرزا کو برابر ستاتے رہتے تھے۔ایک دفعہ کہیں مرزا تفتہ نے یہ لکھ دیا تھا کہ آپ نے بسبب ذوق سخن کے اصلاح اشعار منظور فرمائی تھی۔اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"لاحول ولاقوۃ کس ملعون نے بسبب ذوق شعر کے اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں تو میرا خدا مجھ سے بیزار: میں نے توبہ طریق قہر درویش بجان درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے میرا تمہارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔"

فراخ حوصلگی:

اگر چہ مرزا کی آمدنی قلیل تھی، مگر حوصلہ فراخ تھا۔ سائل ان کے دروازے سے خالی ہاتھ بہت کم جاتا تھا۔ ان کے مکان کے آگے اندھے، لنگڑے، لولے اور اپاہج مرد و عورت ہر وقت پڑے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی آمدنی کچھ اوپر ڈیڑھ سو روپے ماہوار کی ہو گئی تھی اور کھانے پہننے کا خرچ بھی کچھ لمبا چوڑا نہ تھا، مگر وہ غریبوں اور محتاجوں کی مدد اپنی بساط سے زیادہ کرتے تھے، اس لیے اکثر تنگ رہتے تھے۔ غدر کے بعد ایک بار میں نے خود دیکھا کہ نواب لفٹنٹ گورنر کے دربار میں ان کو حسب معمول سات پارچے کا خلعت مع تین رقوم جواہر کے ملا تھا۔ لفٹنٹی کے چپراسی اور جمعدار قاعدے کے موافق انعام لینے کو آئے۔ مرزا صاحب کو پہلے ہی معلوم تھا کہ انعام دینا ہوگا، اس لیے انھوں نے دربار سے آتے ہی خلعت اور رقوم جواہر بازار میں فروخت کرنے کے لیے بھیج دی تھیں، چپراسیوں کو الگ مکان میں بٹھا دیا اور جب بازار سے خلعت کی قیمت آئی تب ان کو انعام دے کر رخصت کیا۔

وہ اپنے ان دوستوں کے ساتھ جو گردش روزگار سے بگڑ گئے تھے، نہایت شریفانہ طور سے سلوک کرتے تھے۔ دلّی کے عمائد میں سے ایک صاحب جو مرزا کے دلی دوست تھے، اور غدر کے بعد ان کی حالت سقیم ہو گئی تھی۔ ایک روز چھینٹ کا فرغل پہنے ہوئے مرزا سے ملنے کو آئے۔ مرزا نے کبھی ان کو مالیدہ یا جامہ دار وغیرہ کے چغوں کے سوا ایسا حقیر کپڑا پہنے نہیں دیکھا تھا۔ چھینٹ کا فرغل ان کے بدن پر دیکھ کر دل بھر آیا۔ ان سے پوچھا کہ یہ چھینٹ آپ نے کہاں سے لی؟ مجھے اس کی وضع بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ آپ مجھے بھی فرغل کے لیے یہ چھینٹ منگوا دیں۔ انھوں نے کہا "یہ فرغل آج ہی بن کر آیا ہے اور میں نے اسی وقت اس کو پہنا ہے۔ اگر آپ کو پسند ہے تو یہی حاضر ہے۔" مرزا نے کہا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اسی وقت آپ سے چھین کر پہن لوں، مگر جاڑا شدت سے پڑ رہا ہے آپ یہاں سے مکان تک کیا پہن کر جائیں گے؟ پھر ادھر ادھر دیکھ کر کھونٹی پر سے اپنا مالیدے کا نیا چغہ اتار کر انھیں پہنا دیا اور اس خوب صورتی کے ساتھ وہ چغہ ان کی نذر کیا۔

وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں بقدر ہزار یک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا، نہ وہ دست گاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بہ در بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔''

حافظہ

جیسی مرزا کی طبیعت میں درا کی اور ذہن میں جودت اور سرعت انتقال تھی، اسی طرح ان کا حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ ان کے گھر میں کتاب کا کہیں نشان نہ تھا ہمیشہ کرائے کی کتابیں منگوا لیتے تھے اور ان کو دیکھ کر واپس بھیج دیتے تھے۔ مگر جو لطیف یا کام کی بات کتاب میں نظر پڑ جاتی تھی ان کے دل پر نقش ہو جاتی تھی۔ فارسی کلام میں وہ کوئی لفظ یا محاورہ یا ترکیب ایسی نہیں برتتے تھے، جس کی سند اہل زبان کے کلام سے نہ دے سکتے ہوں۔ کلکتے میں جن لوگوں نے ان کے کلام پر اعتراض کیے تھے اور جن کے جواب میں مرزا نے مثنوی باد مخالف لکھی تھی۔ ان کو مثنوی کے علاوہ ایک ایک اعتراض کے جواب میں دس دس بارہ بارہ سندیں اساتذہ کے کلام سے لکھ کر علاحدہ بھیجی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطوط میں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ برہان قاطع پر جو کچھ انھوں نے لکھا وہ محض اپنی یادداشت کے بھروسے پر لکھا۔ فکر شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالم سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔

اسی طرح آٹھ آٹھ دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔

شعر فہمی

شعر فہمی اور کتاب فہمی میں وہ ایک مستثنیٰ آدمی تھے کیسا ہی مشکل مضمون ہو وہ اکثر ایک سرسری نظر میں اس کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ نواب مصطفیٰ خان مرحوم "گلشن بے خار" میں مرزا کی نسبت لکھتے ہیں:

"مضامین شعری را کما ھو حقہ می فہمد و بجمیع نکات و لطائف ... می بر دو ایں فضیلتے است کہ مخصوص خواص اہل سخن است۔ اگر طبع سخن شناس داری بایں نکتہ می رسی۔ چہ خوش فکر اگر چہ کمیاب ست، اما خوش فہم کمیاب تر۔ خوشا حال کسیکہ از ہر دو شر بے یافتہ و حظے ربودہ۔ بالجملہ چنیں نکتہ سنج نغز گفتار کمتر مرئی شدہ۔"

نواب ممدوح نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے مرزا کی سخن سنجی کا بہت بڑا ثبوت تھا۔ مولانا آزردہ نے "دور نہیں"، "حور نہیں" اس زمین میں غزل لکھی تھی۔ اس میں اتفاق سے مطلع بہت اچھا نکل آیا تھا۔ مولانا نے اپنی غزل دوستوں کو سنا کر ان سے کہا کہ

"اگر چہ بحر دوسری ہے مگر اسی ردیف و قافیے میں نظیری کی بھی ایک غزل ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

عشق عصیانست اگر مستور نیست
کشتۂ جرم زباں مغفور نیست

ظاہر ہے کہ اگر نظیری ہندی نژاد ہوتا اور اسی زمین میں جس میں ہماری غزل ہے اردو غزل لکھتا تو اس کا مطلع اس طرح ہوتا:

عشق عصیاں ہے اگر مخفی و مستور نہیں
کشتۂ جرم زباں ناجی و مغفور نہیں

آؤ آج مرزا غالب کے ہاں چلیں اور بغیر اس کے کہ قائل کا نام لیا جائے اپنا مطلع اور نظیری کے مطلع کا یہی اردو ترجمہ (جو اوپر مذکور ہوا) مرزا کو سنائیں اور پوچھیں کہ کون سا مطلع اچھا ہے۔''

چونکہ نظیری کا مطلع اردو ترجمے سے بہت پست ہو گیا تھا۔ سب کو یقین تھا کہ مرزا نظیری کے مطلع کو ناپسند کریں گے اور مولانا آزردہ کے مطلع کو ترجیح دیں گے چنانچہ مولانا اور نواب صاحب بعض اور احباب مرزا کے ہاں پہنچے۔ معمولی بات کے بعد مولانا نے کہا کہ اردو کے دو مطلع ہیں ان میں آپ محاکمہ کیجیے کہ کون سا مطلع اچھا ہے اور بطور پیٹھن کے اول نظیری کے مطلع کا یہی ترجمہ پڑھا۔ ابھی مولانا اپنا مطلع پڑھنے نہیں پائے تھے کہ مرزا اس مطلع کو سن کر سر دھننے لگے اور متحیر ہو کر پوچھنے لگے کہ یہ مطلع کس نے لکھا؟ اور اس قدر تعریف کی کہ مولانا آزردہ کو یہ امید نہ رہی کہ اس سے زیادہ میرے مطلع کی داد ملے گی چنانچہ انھوں نے اپنا مطلع نہیں پڑھا اور سب لوگ نہایت تعجب کرتے ہوئے وہاں سے اٹھے۔

کتاب فہمی

مرزا حقائق و معارف کی کتابیں اکثر مطالعہ کرتے تھے اور ان کو خوب سمجھتے تھے۔ نواب ممدوح فرماتے تھے کہ میں شاہ ولی اللہ کا ایک فارسی رسالہ جو حقائق و معارف کے نہایت دقیق مسائل پر مشتمل تھا، مطالعہ کر رہا تھا اور ایک مقام بالکل سمجھ میں نہ آتا تھا اتفاقاً اسی وقت مرزا صاحب آ نکلے۔ میں نے وہ مقام مرزا کو دکھایا۔ انھوں نے کسی قدر غور کے بعد اس کا مطلب ایسی خوبی اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا کہ شاہ ولی اللہ صاحب بھی شاید اس سے زیادہ نہ بیان کر سکتے۔

حسن بیان اور ظرافت

مرزا کی تقریر میں ان کی تحریر اور ان کی نظم و نثر سے کچھ کم لطف نہ تھا اور اسی وجہ سے لوگ ان سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کے مشتاق رہتے تھے۔ وہ زیادہ بولنے والے نہ تھے،

مگر جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا تھا لطف سے خالی نہ ہوتا تھا۔ ظرافت مزاج میں اس قدر تھی کہ اگر ان کو بجائے حیوان ناطق کے حیوان ظریف کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن بیان حاضر جوابی اور بات میں سے بات پیدا کرنا ان کی خصوصیات میں سے تھا۔

لطیفہ

ایک دفعہ جب رمضان گزر چکا تو قلعے میں گئے۔ بادشاہ نے پوچھا: ''مرزا تم نے کتنے روزے رکھے؟'' عرض کیا: ''پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا۔''

ایک دن نواب مصطفیٰ خاں کے مکان پر ملنے کو آئے، ان کے مکان کے آگے چھتہ بہت تاریک تھا۔ جب چھتے سے گزر کر دیوان خانے کے دروازے پر پہنچے تو وہاں نواب صاحب ان کے لینے کو کھڑے تھے۔ مرزا نے ان کو دیکھ کر یہ مصرع پڑھا: ''آب چشمۂ حیوان درون تاریکیست۔'' جب دیوان خانے میں پہنچے تو اس کا دالان میں بسبب شرق رویہ ہونے کے دھوپ بھری ہوئی تھی۔ مرزا نے وہاں یہ مصرع پڑھا: ''ایں خانہ تمام آفتاب ست۔''

ایک صحبت میں مرزا میر تقی کی تعریف کر رہے تھے۔ شیخ ابراہیم ذوق بھی موجود تھے۔ انھوں نے سودا کو میر پر ترجیح دی۔ مرزا نے کہا: ''میں تو تم کو میری سمجھتا تھا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سودائی ہیں۔''

لطیفہ

مکان کے جس کمرے میں مرزا دن بھر بیٹھتے اٹھتے تھے وہ مکان کے دروازے کی چھت پر تھا اور اس کے ایک جانب ایک کوٹھری تنگ و تاریک تھی جس کا در اس قدر چھوٹا تھا کہ کوٹھری میں بہت جھک کر جانا پڑتا تھا۔ اس میں ہمیشہ فرش بچھا رہتا تھا اور مرزا اکثر گرمی اور لو کے موسم میں دس بجے سے تین چار بجے تک وہاں بیٹھتے تھے۔ ایک دن جب کہ رمضان کا مہینہ اور گرمی کا موسم تھا، مولانا آزردہ ٹھیک دوپہر کے وقت مرزا سے ملنے کو چلے آئے۔ اس وقت مرزا صاحب اسی کوٹھری میں کسی دوست کے ساتھ چوسر یا شطرنج کھیل

رہے تھے۔ مولانا بھی وہیں پہنچے اور مرزا کو رمضان کے مہینے میں چوسر کھیلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگے کہ ''ہم نے حدیث میں پڑھا تھا کہ رمضان کے مہینے میں شیطان مقید رہتا ہے، مگر آج اس حدیث کی صحت میں تردّد پیدا ہو گیا۔'' مرزا نے کہا: ''قبلہ! حدیث بالکل صحیح ہے، مگر آپ کو معلوم رہے کہ وہ جگہ جہاں شیطان مقید رہتا ہے، وہ یہی کوٹھڑی تو ہے۔''

الغرض مرزا کی کوئی بات لطف اور ظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ان کے تمام ملفوظات جمع کرتا تو ایک ضخیم کتاب لطائف وظرائف کی تیار ہو جاتی۔

(یادگار غالب)

انتخابِ نظم

انتخابِ غزلیات

(۱)

رنج اور رنج بھی تنہائی کا　　وقت پہنچا مری رُسوائی کا
عمر شاید نہ کرے آج وفا　　کاٹنا ہے شب تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا　　کس کو دعوی ہے شکیبائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم　　شوق تھا بادیہ پیمائی کا
اِس سے ناداں ہی بن کر ملیے　　کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھہرتی آنکھ　　حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک　　ہم کو دعوی نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی　　ہے جو یہ شوق آرائی کا
اس کو چھوڑا ہے تو لیکن اے دل　　مجھ کو ڈر ہے تری خود رائی کا
بزم دشمن میں نہ جی سے اترا　　پوچھنا کیا تری زیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصل خزاں!　　گل و بلبل کی شناسائی کا
مدد اے جذبہ توفیق کہ یاں　　ہو چکا کام توانائی کا
محتسب! عذر بہت ہیں لیکن　　اِذن ہم کو نہیں گویائی کا

ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دور ہے رسوائی کا

(۲)

دل سے خیال دوست بھلایا نہ جائے گا — سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائے گا
تم کو ہزار شرم سہی مجھ کو لاکھ ضبط — اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا
مے تند و ظرف حوصلۂ اہل بزم تنگ — ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائے گا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر — دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائے گا
کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے — پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں، جانتے ہیں وہ — ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا

جھگڑوں میں اہل دیں کے نہ حالی پڑیں بس آپ
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

(۳)

مجھ میں وہ تاب ضبط شکایت کہاں ہے اب — چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب
آنے لگا جب اس کی تمنا میں کچھ مزا — کہتے ہیں لوگ، جان کا اس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو، بلا ہے حسینوں کا التفات — اے دل سنبھل! وہ دشمن دیں مہرباں ہے اب
اک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا — ہم ہیں اور آستانۂ پیر مغاں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علم و دیں کدھر ہے، وہ تقویٰ کہاں ہے اب؟

(۴)

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

زیرِ برقع تو نے کیا دکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت

سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اس کی رعنائی بہت

آرہی ہے چاہ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

کردیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت

گھٹ گئیں خود تلخیاں ایام کی
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت

ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رسوائی بہت

(۵)

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہوگئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ دَر کی صورت

کس سے پیمان وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صورت

ہے غم روز جدائی نہ نشاط شب وصل
ہوگئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت

اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

دیکھئے شیخ! مصوّر سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو! آتش دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیمِ سپر کی صورت

شوق میں اس کے مزا، درد میں اس کے لذّت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت

حملہ اپنے بھی اک بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈرانی ہے بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

(۶)

عالم آزاد گاں ہے اک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں ان کی اور ان کا آسماں سب سے الگ
پاک ہیں آلائشوں میں بندشوں میں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
سب کی سُن لیتے ہیں لیکن اپنے کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور ان کا رازداں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

(۷)

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں
ہیں دور جام اول شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں
یارب! اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اس کو ہم سے ربط، مگر اس قدر کہاں
اک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں
بس ہو چکا ہے بیاں کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اس خانماں خراب نے ڈھونڈھا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں، وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول، دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی، نشاط نغمہ و مے ڈھونڈھتے ہو اب؟
آئے ہو وقت صبح، رہے رات بھر کہاں

(۸)

اب وہ اگلا سا التفات نہیں
جس پہ بھولے تھے اب وہ بات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ
زندگی موت ہے حیات نہیں
یوں ہی گزرے تو سہل ہے لیکن
فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجئے بیاں
سرسری دل کی واردات نہیں
قیس ہو، کوہکن ہو یا حالؔی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

(۹)

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں
قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح
لگادو آگ کوئی آشیاں میں
نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دِل پُردرد سے کچھ کام لوں گا
اگر فرصت ملی مجھ کو جہاں میں
بہت جی خوش ہوا حالؔی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

(۱۰)

دھوم تھی اپنی پارسائی کی
کی بھی اور کس سے آشنائی کی

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جُدائی کی

لاگ میں ہے لگاؤں کی باتیں
صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی

دل رہا پائے بند الفت دام
تھی عبث آرزو رہائی کی

شہر و دریا سے ، باغ و صحرا سے
بو نہیں آتی آشنائی کی

نہ ملا کوئی غارتِ ایماں
رہ گئی شرم پارسائی کی

زندہ پھر نے کی ہے ہوس حالؔی
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

○

آخری عمر کی غزل

یہ غزل دیوان حالؔی ۱۸۹۳ کے بعد کی ہے۔ اس لیے علاحدہ لکھی جارہی ہے۔ محفوظ ہوجانے کے خیال سے اس کا انتخاب کیا گیا ہے۔

کہاں فکر میں اب وہ جولانیاں — وہ دریائے معنی کی طغیانیاں
کہاں وہ طبیعت کی رنگینیاں — وہ بزم سخن میں گل افشانیاں
کہاں اب وہ جلسوں میں احباب کے — سخن سنجیاں اور سخن رانیاں
دکھائی جوں ہی دور گردوں نے آنکھ — گئے بھول ساری غزل خوانیاں
جھکے بن زمانہ سے بنتی نہیں — رگڑنی ہیں یہاں سب کو پیشانیاں
لگے بڑھنے جیسے کہ ہوش و خرد — لگیں ساتھ بڑھنے پریشانیاں
بڑھاپے کی دانائی لے کر کوئی — بدل دے وہ بچپن کی نادانیاں
اگر راست گوئی کی جرأت نہیں — تو جھوٹی ہیں واعظ کی لسانیاں
منادی نہیں حق کی کچھ دل لگی — بہت یاں ہیں درکار قربانیاں
گئے جھیل چپ چاپ گر مشکلیں — یہی مشکلیں ہیں پھر آسانیاں
ہو ناپید جس ملک میں اتفاق — ہیں آبادیاں وہاں کی ویرانیاں
بھریں خرقہ پوش اب کوئی اور روپ — یہ شکلیں تو ہیں جانی پہچانیاں
وہی لے گئے یہاں سے زاد سفر — گئے جھاڑ جو اپنی ہمسانیاں
لگاؤ نہ اس دارفانی سے دل[1] — عیاں اس کی ہیں ست پیمانیاں

جو یہاں آج ہے جوش عیش و نشاط
تو کل حسرتوں کی ہیں طغیانیاں

پھر آرام برسوں نہیں یہاں نصیب
اگر چار دن ہیں تن آسانیاں

''چمن ہے کہ ہے سیمیائی نمود''
یہ کہتی ہیں نرگس کی حیرانیاں

گل آواز بلبل پہ ہیں ہنس رہے
کہ کے دن کی ہیں یہ خوش الحانیاں

متاع وفا کا ہے دنیا میں کال
مگر کاہکوں کی ہیں ارزانیاں

لگادیتے ہیں اس کی قیمت میں جو
شہنشاہیاں اور سلطانیاں

کھلونوں پہ مرتے ہیں سر پھوڑ پھوڑ
یہ داناؤں کی یہاں ہیں نادانیاں

جھپٹتے ہیں مردار کی پا کے لو
یہ ہیں شیر مردوں کی جولانیاں

بنی نوع کے دوست کرتے ہیں آہ
بنی نوع پر آتش افشانیاں

کلیجے کے ٹکڑوں سے ہوتی ہیں یہاں
سدا چیل کوؤں کی مہمانیاں

جہاں سوزیوں کا ہے گویا کہ نام
جہاں داریاں اور جہاں بانیاں

ڈبوتی ہیں آخر کو منجمد ھار میں
یہ فرعونیاں اور ہامانیاں

محبت کا دنیا کے حالیؔ مآل
پشیمانیاں ہیں پشیمانیاں

○

---

۱ یہ قطعہ روس اور جاپان کی لڑائی کے زمانہ میں لکھا تھا۔

برکھارُت

(۱۸۷۴ء)

گرمی کی تپش بجھانے والی
سردی کا پیام لانے والی
قدرت کے عجائبات کی کان
عارف کے لیے کتاب عرفان
وہ شاخ و درخت کی جوانی
وہ مور و ملخ کی زندگانی
وہ سارے برس کی جان برسات
وہ کون؟ خدا کی شان برسات
آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
وہ آئی تو آئی جان میں جان
سب تھے کوئی دن کے ورنہ مہمان
گرمی سے تڑپ رہے تھے جاں دار
اور دھوپ میں تپ رہے تھے کہسار
بھوبل سے سوا تھا ریگِ صحرا
اور کھول رہا تھا آبِ دریا
تھی لوٹ سی پڑ رہی چمن میں
اور آگ سی لگ رہی تھی بن میں
طوفان تھے آندھیوں کے برپا
اٹھتا تھا بگولے پر بگولا
آرے تھے بدن پہ لو کے چلتے
شعلے تھے زمین سے نکلتے
تھی سب کی نگاہ سوئے افلاک
پانی کی جگہ برستی تھی خاک
پنکھے سے نکلتی جو ہوا تھی
وہ بادِ سموم سے سوا تھی
بجھتی نہ تھی آتشِ درونی
لگتی تھی ہوا سے آگ دونی
بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکلِ انسان
تھا شہر میں قحط آدمی زاد
سلطان کا اک کنواں تھا آباد
کل شام تلک تو تھے یہی طور
پر رات سے ہے سماں ہی کچھ اور
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسماں پہ برپا

مینہ کا ہے زمیں پر دریڑا گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
گھنگھور گھٹائیں چھارہی ہیں جنت کی ہوائیں آرہی ہیں
باغوں نے کیا ہے غسل صحت کھیتوں کو ملا ہے سبز خلعت
بٹیا ہے نہ ہے سڑک نمودار اٹکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
ہے سنگ و شجر ایک وردی عالم ہے تمام لاجوردی
پھولوں سے پٹے ہوئے ہیں کہسار دولھا سے بنے ہوئے ہیں اشجار
پانی سے بھرے ہوئے ہیں جل تھل ہے گونج رہا تمام جنگل
کرتے ہیں پپیہے پیو پیو اور مور چنگھاڑتے ہیں ہر سو
کوئل کی ہے کوک جی لبھاتی گویا کہ ہے دل میں بیٹھی جاتی
سب خوان کرم سے حق کے ہیں سیر پانی میں مگر، کچھار میں شیر
زردار ہیں اپنے مال میں مست قلاّنچ ہیں اپنی کھال میں مست
ابر آیا ہے گھر کے آسماں پر کلمے ہیں خوشی کے ہر زباں پر
جاتا ہے کوئی ملہارگاتا ہے دیس میں کوئی گنگناتا
بھنگی ہیں نشے میں گاتے پھرتے اور بانسریاں بجاتے پھرتے
سرون کوئی گارہا ہے بیٹھا چھیڑا ہے کسی نے ہیر رانجھا
ہیں شکر گزار تیرے برسات انسان سے لے کے تا جمادات
گلشن کو دیا جمال تونے کھیتی کو کیا نہال تونے
شب بھر میں ہوا سماں دگر گوں کیا پڑھ دیا آکے تونے افسوں
سوئے تو اساڑھ کا عمل تھا اٹھے تو سماں ہے ماہ کا سا
لاہور میں شب ہوئی تھی لیکن کشمیر میں پہنچے جب ہوا دن
امرت سا ہوا میں بھر دیا کچھ اک رات میں کچھ سے کردیا کچھ
دریا تجھ بن سسک رہے تھے اور بَن تری راہ تک رہے تھے
دریاؤں میں تونے ڈال دی جان اور تجھ سے بنوں کو لگ گئی شان

جن جھیلوں میں کل تھی خاک اُڑتی ملتی نہیں آج تھاہ ان کی
جن باغوں میں اُڑتے تھے بگولے واں سیکڑوں اب پڑے ہیں جھولے
تھے ریت کے جس زمیں پہ انبار ہے بیر بہٹیوں سے گلزار
کھم باغوں میں جا بجا گڑے ہیں جھولے ہیں کہ سو بہ سو پڑے ہیں
کچھ لڑکیاں بالیاں ہیں کم سن جن کے ہیں یہ کھیل کو دکے دن
ہیں پھول رہی خوشی سے ساری اور جھول رہی ہیں باری باری
جب گیت ہیں ساری مل کے گاتی جنگل کو ہیں سر پہ وہ اُٹھاتی
اک سب کو کھڑی جھلا رہی ہے اک گرنے سے خوف کھا رہی ہے
ہے ان میں کوئی ملہار گاتی اور دوسری پینگ ہے چڑھاتی
گاتی ہے کبھی کوئی ہنڈولا کہتی ہے کوئی بدیسی ڈھولا
اک جھولے سے وہ گری ہے جاکر سب ہنستی ہیں قہقہے لگاکر
ندّی نالے چڑے ہوئے ہیں تیراکوں کے دل بڑھے ہوئے ہیں
گھڑناؤ پہ ہے سوار کوئی اور تیر کے پہنچا پار کوئی
بگلوں کی ہیں ڈاریں آکے گرتی مرغابیاں تیرتی ہیں پھرتی
چکلے ہیں یہ پاٹ ندیوں کے دن بھر میں ہیں بیڑے جاکے لگتے
زوروں پہ چڑھا ہوا ہے پانی موجوں کی ہیں صورتیں ڈرانی
ناویں ہیں کہ ڈگمگا رہی ہیں موجو ں کے تھپیڑے کھا رہی ہیں
ملاحوں کے اڑ رہے ہیں اوسان بیڑے کا خدا ہی ہے نگہبان
بیزار اک اپنی جان و تن سے بچھڑا ہوا صحبت و طن سے
غم خوار ہے کوئی اور نہ دل جو اک باغ میں ہے پڑا لبِ جو
ابر اتنے میں اک طرف سے اٹھا اور رنگ سا کچھ ہوا کا بدلا
برق آکے لگی تڑپنے پیہم اور پڑنے لگی پھوار کم کم
سامان ملے جو دل لگی کے یاد آئے مزے کبھی کبھی کے

دیکھے کوئی اس گھڑی کا عالم — وہ آنسوؤں کی جھڑی کا عالم
وہ آپ ہی آپ گنگنانا — اور جوش میں آ کبھی یہ گانا
اے چشمۂ آب زندگانی — گھٹیو نہ کبھی تری روانی
جاتی ہے جدھر تری سواری — بستی ہے اسی طرف ہماری
پائے جو کہیں مری سبھا کو — دیتا ہوں میں بیچ میں خدا کو
اول کہیو سلام میرا — پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں یہی تھا اپنی لکھا — فرقت میں تمہاری آئی برکھا
آتا ہے تمہارا دھیان جس دم — مرغابیاں تیرتی ہیں باہم
ہم تم یونہی صبح و شام اکثر — تالاب میں تیرتے تھے جاکر
جب سبزہ و گل ہیں لہلہاتے — صحبت کے مزے ہیں یاد آتے
ہم تم یونہی بات میں دیے بات — پھرتے تھے ہوائیں کھاتے دن رات
جب پیڑ سے آم ہے ٹپکتا — میں تم کو ادھر اُدھر ہوں تکتا
آخر نہیں پاتا جب کسی کو — دیتا ہوں دعائیں بے کسی کو
رت آم کی آئے اور نہ ہوں یار — جی اپنا ہے ایسی رت سے بیزار
تم بن جو ہے بوند تن پہ پڑتی — چنگاری سی ہے بدن پہ پڑتی
ہے سرد ہوا بدن کو لگتی — پر دل میں ہے آگ سی سلگتی
پردیس میں سچ ہے کیا ہو جی شاد — جب جی میں بھری ہو دیس کی یاد
نشتر کی طرح تھی دل میں چبھتی — فریاد یہ درد ناک اس کی
تھا سوز میں کچھ ملا ہوا ساز — پکڑا دل سن کے اس کی آواز
حیرت رہی دیر تک کہ آخر — روڑا ہے کہاں کا یہ مسافر
پھر غور سے اِک نظر جو ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

○

انتخاب

مدوجزر اسلام

یکا یک ہوئی غیرتِ حق کو حرکت
بڑھا جانبِ بوقبیس ابر رحمت
ادا خاک بطحا نے وہ ودیعت
چلے آتے تھے جس کی دیتے شہادت
ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
نہ چھٹکی مگر چاندنی ایک مدت
کہ تھا ابر میں ماہتابِ رسالت
پہ چالیسویں سال لطف خدا سے
کیا چاند نے کھیت غارِ حرا سے
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ
خطا کار سے دَر گزر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا

مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخہ کیمیا ساتھ لایا
مس خام کو جس نے کندن بنایا
کھرا اور کھوٹا الگ کر دکھایا

عرب جس پہ قرنوں سے تھا جہل چھایا
پلٹ دی بس اک آن میں اُس کی کایا

رہا ڈر نہ بیڑے کو موجِ بلا کا
اِدھر سے اُدھر پھر گیا رخ ہوا کا
وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس سے ساری ہلادی

نئی اِک آواز میں سوتی بستی جگادی

پڑا ہر طرف غل یہ پیغام حق سے
کہ گونج اٹھے دشت وجبل نامِ حق سے

سبق پھر شریعت کا اُن کو پڑھایا
حقیقت کا گر اُن کو ایک اک بتایا
زمانے کے بگڑے ہوؤں کو بنایا
بہت دن کے سوتے ہوؤں کو جگایا

کھلے تھے نہ جو راز اب تک جہاں پر
وہ دکھلا دیے ایک پردہ اٹھا کر

○

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی

متخلص بہ غالب

(۱۸۶۹ء)

کیا کہوں حال درد پنہانی — وقت کوتاہ قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد — دیکھ کر رنگِ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال — گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریب وہم و گماں — تاج فغفور و تخت خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب — جام جمشید و راح ریحانی
لفظ مہمل ہے نطقِ عرابی — حرف باطل ہے عقل یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی — اک تماشا ہے حسن کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک — چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ ایک مشت خاک کے بدلے — گر ملے خاتم سلیمانی
بحر ہستی بجز سراب نہیں — چشمۂ زندگی میں آب نہیں
جس سے دنیا نے آشنائی کی — اس نے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر — تو نے کی جس سے بے وفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ — ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اس کی — صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظ وصل سے محروم — جس کو یہاں طاقت نہ ہو جدائی کی
ہے یہاں حفظ وضع سے مایوس — جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گل سے بے بقاتر ہے — شان ہو جس میں دل ربائی کی
جنس کاسد سے ناروا تر ہے — خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس — آج خاقانی و سنائی کی
رشک عرفی و فخر طالب مرد — اسد اللہ خان غالب مرد
بلبل ہند مر گیا ہیہات — جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس — پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج — رند اور مرجع کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل — دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہوگیا نقش دل پہ جو لکھا — قلم اس کا تھا اور اس کی دوات
تھیں تو دلی میں اس کی باتیں تھیں — لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اس کے مرنے سے مر گئی دلی — خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم — یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا، نہ رہا — شہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا
دل کو باتیں جب اس کی یاد آئیں — کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جاکر سنائیں شعر و غزل — کس سے داد سخنوری پائیں
مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب — کس سے اصلاح لیں، کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ استاد — کس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں — اہل میت جنازہ ٹھہرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالب کو — سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح — اہل انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم — لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے — ہے ادب شرط منہ نہ کھلوائیں
غالب نکتہ داں سے کیا نسبت — خاک کو آسماں سے کیا نسبت
نثر، حسن وجمال کی صورت — نظم غنج و دلال کوصورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئنہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ہجراں وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوح امکاں سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صوررت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے
غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈھے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشک بار ہے آج

نازشِ خلق کا محل نہ رہا
رحلت فخرِ روزگار ہے آج

تھا زمانے میں ایک رنگیں طبع
رخصت موسم بہار ہے آج

بار احباب جو اٹھاتا تھا
دوش احباب پر سوار ہے آج

تھی ہر اک بات نیشتر جس کی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج

دل میں مدت سے تھی خلش جس کی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج

دلِ مضطر کو کون دے تسکیں
ماتم یار غم گسار ہے آج

تلخئ غم کہی نہیں جاتی
جان شیریں بھی نا گوار ہے آج

کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد

نقد معنی کا گنج داں نہ رہا
خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہارِ سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا ایک ایک کارواں سالار
کوئی سالار کارواں نہ رہا

رونق حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازار گل رخساں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کریں گے کس پر ناز
رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیوں کر رہے گا نام ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمیں اوروہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا، تھا جو مایہ دار سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کارنہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گزارنہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسین
سخن اس کا کسی پہ بارنہ تھا

نذر سائل تھی جان تک، لیکن
در خور ہمت اقتدارنہ تھا

ملک ودولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پہ اختیار نہ تھا

خاکساروں سے خاکساری تھی
سربلندوں سے انکسارنہ تھا

ایسے پیدا کہاں ہیں مست وخراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں

شہر سارا بنا ہے بیت حزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں

ملک یک سر ہوا ہے بے آئیں
اک فلاطون نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رمّاں میں

حصر تھی اک بیاں میں رنگینی
کیا دھرا ہے عقیق ومر جاں میں

لب جادو بیاں ہوا خاموش
گوش گل واہے کیوں گلستاں میں

گوش معنی شنو ہوا بے کار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں

وہ گیا جس سے بزم تھی روشن
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں

نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہ کامل میں آگئی ظلمت — آب حیواں پہ چھاگئی ظلمت
ہند میں نام پائے گا اب کون — سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف — ان پر ایمان لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے — اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش — وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون
اس سے ملنے کو یاں ہم آتے تھے — جاکے دلی سے آئے گا اب کون
مر گیا قدر دان فہم سخن — شعر ہم کو سنائے گا اب کون
مر گیا تشنۂ مذاق کلام — ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساط سخن میں شاطر ایک — ہم کو چالیں بتائے گا اب کون
شعر میں نا تمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

کم لنافیہ من بکے و عویل
و عتاب مع الزمان طویل

انتخاب رباعیاتِ حالی

طوفاں میں ہے جب جہاز چکّر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

⊙

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے
طاعت میں ہے تیری آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور
سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

⊙

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دلِ زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

⊙

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود اک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دُور بہت

⊙

جو کرتے ہیں کچھ، زباں سے کہتے ہیں وہ کم
ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسنِ گفتار
بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

⊙

دنیائے دنیٰ کو ہمیشہ نقش فانی سمجھو
رودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو

⊙

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغام بکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اک دامن میں
محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی
جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک
ہے جوہر انسان کی کسوٹی سونا

دولت کی ہوس، اصل گدائی ہے یہ
سامان کی حرص، بے نوائی ہے یہ
حاجت کم ہے، تو ہے یہ شاہنشاہی
اور کچھ نہیں حاجت، تو خدائی ہے یہ

حاصل ہے اگر خوشی تو ہے غم کی تلاش
گر شہد میسّر ہے تو ہے سم کی تلاش
قانع نہیں کوئی حالت نقد پہ یاں
جنت میں بھی شاید ہو جہنم کی تلاش

گھر بار اپنا ہے اور نہ دولت اپنی
کنبہ اپنا، نہ ہے قرابت اپنی
اپنی نہیں کوئی چیز یاں دو کے سوا
اک موت اپنی ہے ایک تُربت اپنی

متفرق اشعارِ حالؔی

تم کو ہزار شرم سہی مجھکو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائے گا

آرہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

غنچہ چٹکا اور آپہنچی خزاں
فصلِ گل کی تھی فقط اتنی بساط

پھر زخم پھوٹ نکلا، حالی نہ چھیڑنا تھا
فصلِ خزاں کا قصّہ ذکرِ گل وسمن میں

ہوتی نہیں قبول دعا ترک عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

کیوں بڑھاتے ہو اختلاط بہت
ہم کو طاقت نہیں جدائی کی

ہر بول تیرا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگ بیاں حالی ہے سب سے جدا تیرا

چٹکیاں سی دل میں یہ لیتا ہے کون　　شعر تو سب ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

کیجیے کیا حالی نہ کیجیے سادگی گر اختیار　　بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی　　مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا　　یہی ایک دن کام کر جائے گی

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے　　غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن　　راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے جب　　سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک　　اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب　　چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب

قربِ حق کے لیے کچھ سوز نہاں ہے بھی ضرور　　خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ　　دل نہیں حاضر تو دُنیا ہے اجاڑ

سخن میں پیروی کی گر سلف کی　　انہیں باتوں کی دہرانا پڑے گا

ٹپکتا ہے اشعار حالی سے حال
کہیں سادہ دل مبتلا ہو گیا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیار ہے وہ
اس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

جن کے معبود حور و غلماں ہوں
ان کو زاہد خدا سے کیا مطلب

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دل کش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

حالی بس اب یقیں ہے کہ دلّی کے ہو رہے
ہے ذرّہ ذرّہ مہر فضا اس دیار کا

گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار، ہیچ

ایسی غزلیں سنیں نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

کتابیات

۱	اردو شاعری کا سماجی پس منظر	ڈاکٹر اعجاز حسین	۱۹۶۸
۲	ادب اور زندگی	مجنوں گورکھ پوری	۱۹۶۵
۳	اردو شاعری پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	۱۹۵۶
۴	ارمغان حالی	پروفیسر حمید احمد خاں	۱۹۷۱
۵	ترقی پسند ادب	علی سردار جعفری	۱۹۵۲
۶	ترقی پسند ادبی تحریک	خلیل الرحمٰن اعظمی	۱۹۷۲
۷	تنقیدیں	خورشید الاسلام	۱۹۵۷
۸	جدید نظم حالی سے میراجی تک	کوثر مظہری	۲۰۰۵
۹	جواہر حالی	ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	۱۹۸۹
۱۰	ذوق ادب اور شعور	احتشام حسین	۱۹۵۵
۱۱	چند ہم عصر	مولوی عبدالحق	۱۹۵۸
۱۲	حالی	صالحہ عابد حسین	۱۹۸۳
۱۳	حالی	مالک رام	
۱۴	الطاف حسین حالی	خلیق انجم	
۱۵	حالی بحیثیت شاعر	شجاعت علی سندیلوی	۱۹۷۱
۱۶	حیات جاوید	خواجہ الطاف حسین حالی، تعارف ڈاکٹر قمر رئیس	۱۹۷۶
۱۷	حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۹۷۰

۱۸	دیوان حالی مقدمہ	رشید حسن خاں	۱۹۹۹
۱۹	غزلیاتِ حالی	ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی	۱۹۸۳
۲۰	لکھنؤ کا دبستان شاعری		
۲۱	مقدمہ شعر و شاعری	خواجہ الطاف حسین حالی	
		مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی	۱۹۹۳
۲۲	نقش حالی	نورالحسن ہاشمی	
۲۳	مجموعہ نظم حالی	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی	
۲۴	نئے اور پرانے چراغ	آل احمد سرور	۱۹۵۵
۲۵	یادگارِ غالب	خواجہ الطاف حسین حالی	۱۹۷۷
۲۶	یادگارِ حالی	صالحہ عابد حسین	۱۹۹۹

اُردو اکادمی دہلی

کے چند اہم مونوگراف

شیخ ظہورالدین حاتم
مرتب: پرفیسر عبدالحق
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۰

میر ناصر علی دہلوی
مرتب: ڈاکٹر ارتضیٰ کریم
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

شاہ نجم الدین مبارک آبرو
مرتب: پروفیسر خالد محمود
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

دیوانِ غالب
(صدی ایڈیشن، اردو۔ ہندی)
مرتب: علی سردار جعفری
قیمت: ۳۰۰ روپے، صفحات: ۴۷۲

مومن خاں مومن
مرتب: ڈاکٹر توقیر احمد خاں
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۰

قائم چاندپوری
مرتب: ڈاکٹر خالد علوی
قیمت: ۱۰۰ روپے، صفحات: ۲۶۴

مرزا محمد رفیع سودا
مرتب: ڈاکٹر مظہر احمد
قیمت: ۵۰ روپے، صفحات: ۱۸۴

میر اثر
مرتب: ڈاکٹر مولا بخش
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۱۲

میر امّن
مرتب: پروفیسر ابن کنول
صفحات: ۱۵۲، قیمت: ۴۰ روپے

مرزا غالب (مکتوب نگاری)
مرتب: ڈاکٹر خالد اشرف
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۸

فائز دہلوی
مرتب: ڈاکٹر کوثر مظہری
قیمت: ۳۰، صفحات: ۱۲۸

سرسیّد احمد خاں
مرتب: پروفیسر افتخار عالم خاں
قیمت: ۳۰ روپے، صفحات: ۱۲۰

خواجہ میر درد
مرتب: پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
زیر طبع

مرزا غالب (شاعری)
مرتب: پروفیسر ابوالکلام قاسمی
زیر طبع

محمد حسین آزاد
مرتب: پروفیسر عتیق اللہ
زیر طبع

رابطہ: سی۔ پی۔ او۔ بلڈنگ، کشمیری گیٹ، دہلی Ph : 23863858, Fax : 23863773

Rs. 45/-